جلد 6 شمارہ 2 اپریل 2004ء صفر 1425ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

Registerd

CPL No. 4

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

اغراض ومقاصد

- کتاب اللہ اور سنت رسول ﷺ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول ﷺ کثرت ذکر، مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم فروغ دینا۔
- کشف وکرامات کی بجائے اللہ تعالی کے قرب وعرفان اور اسکی رضا ولقاء کے حصول مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا۔
- حضور ﷺ کے صحابہ کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کر ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت ہی مختصر سہل العمل اورادو اذکار کی تلقین۔
- غصہ ونفرت، حسد وبغض، تجسس وغیبت اور ہوا وہوس جیسی برائیوں کو تر کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم ورضا، عالمگیر محبت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاض اور مجاہدے کی بنیاد بنانا۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا، تزکیہ نفس تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل وعیال اور احبا کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا۔
- اللہ تعالی کی رضا، اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح وخدمت کے کام کو آگے بڑھانا۔ مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالی کی محبت بیدار کرنا روحانی توجہ سے انکے اخلاق کی اصلاح کرنا۔

عالمگیر محبت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا علمبردار

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

بیادگار خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ

بانی سلسلہ

ماہنامہ گوجرانوالہ

آدمیت

فلاح

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان
کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

نگران و سرپرست

محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 6 شمارہ 2 اپریل 2004ء صفر 1425ھ

قیمت ——— -/20 روپے

سالانہ فنڈ ——— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:0431-862835

Mob: 0320-5793520

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:0431-881379

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-431-222020

E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

اداریہ

تنہا اِسلام کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے تعمیر اخلاق کے لئے جس پیانہ و معیار کا انتخاب کیا اِس میں دونوں طرح کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ یہ اپنی جگہ جامع بھی ہے اور اس لائق بھی ہے کہ اخلاق و سیرت کو سنوارنے کے سلسلہ میں مثبت اور تخلیقی کردار ادا کر سکے۔ یہ پیانہ ''تقویٰ'' کی اصطلاح سے تعبیر ہے۔ ''تقویٰ'' کو قرآن حکیم نے ایک اصولی محرک ایک جامع معیار اور فکر و عمل کا ایک تخلیقی پیانہ قرار دیا ہے۔ اِس کا اندازہ دو چیزوں سے ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن حکیم میں یہ لفظ، اپنے مختلف **مشتقات** کے ساتھ قریب قریب ہر اِس سیاق میں استعمال ہوا ہے جہاں مسلمانوں کو کسی نہ کسی نیکی، خوبی اور فضیلت کے اتصاف پر آمادہ کیا گیا ہے، دوسرے اخلاق و سیرت کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جس کی تکمیل، تحسین اور ترقی کے لئے قرآن حکیم میں یہ لفظ استعمال نہ ہوا ہو۔ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے۔ اِس سوال کا جواب ہمیں قرآن حکیم کی آیات ہی میں ڈھونڈنا چاہیے۔ قرآن حکیم کی رو سے تقویٰ کے معنی تعلق باللہ، محبت الٰہی اور اِس کی صفات قدسیہ سے کسب فیض کی ایسی کیفیت اور مقام کے ہیں، جس کے حصول کے بعد مومن اپنی پوری زندگی میں خیر و خوبی کی طرف مسلسل قدم بڑھاتا رہتا ہے۔ اِس مقام پر فائز ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیکی اِس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتی ہے۔ اِس کا نصب العین اور روح کی غذا قرار پاتی ہے اور اِس کی تمام تر تگ و دو کا مدار و محور بن جاتی ہے۔

''اور جو تقویٰ کا لباس ہے وہی سب سے بہتر ہے'' (الاعراف ۔ ۲۶)

''اور حج کے لئے زادراہ کا اہتمام کرو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے'' (بقرہ ۔ ۱۹۷)

جب کوئی شخص تقویٰ کی اِن کیفیتوں سے بہرہ ور ہو جاتا ہے تو اِس میں خود بخود ایسی بصیرت اور فکر و نظر کی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کے ذریعہ وہ نیکی اور برائی میں ذوق و امتیاز کے حدود صاف پہچاننے لگتا ہے۔

''مومنو! اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں حق و باطل میں امتیاز کرنے کی قوت و صلاحیت بخش دے گا''۔ (انفال ۔ ۲۹)

یہی نہیں تقویٰ اختیار کر لینے سے مومن کے لئے تائید ایزدی سے یسر و آسانی اور فلاح و کامرانی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

''اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے لئے رنج و محن سے مخلصی کی راہ پیدا کر دے گا۔'' (الطلاق ۔ ۴)

"اور جو شخص تقویٰ اختیار کرے گا اللہ اس کے کاموں میں سہولت پیدا کر دے گا اور جو شخص اللہ اور اِس کے رسول کی اطاعت کرے گا اور اللہ سے ڈرے گا، اور تقویٰ کو اپنائے گا، ان کو جان لینا چاہیے کہ یہی لوگ فائز اور کامیاب ہیں"۔ (النور۔52)

جب کوئی شخص تقویٰ کی لذت سے آشنا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ذاتی سطح پر محبت و اطاعت کے رشتوں کو استوار کر لیتا ہے یا جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے اور اس کی صفات کمال کی روشنی میں قدم فرسا ہونے کی خو پیدا کر لیتا ہے تو علاوہ اِس بات کے کہ وہ دنیا کے رنج و محن اور ابتلا و آزمائش کی صعوبتوں سے مخلصی حاصل کر لیتا ہے اور توفیق ایزدی کے انعام کو پا لینے میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے، ایسے اسلوب فکر و نظر سے بھی بہرہ مند ہو جاتا ہے جو اِس کو رضائے الٰہی کے حسین سانچوں میں ڈھال دیتا ہے اور اِس کی سیرت و کردار کے گوشوں کو چمکا اور سنوار دیتا ہے، جو ہر عمل میں اِس کی رہنمائی و ہدایت کا فریضہ انجام دیتا ہے اور ترغیبات و ترہیبات میں اِس کے لئے سپر ثابت ہوتا ہے۔ تقویٰ نہ صرف، اعمال کو سنوارتا اور جلا دیتا ہے بلکہ اِس میں اخلاق و احسان کا رنگ بھی بھرتا ہے، اِس میں لطافت و معنویت بھی پیدا کرتا ہے اور اِنسان کو اِس کی محدود اور فانی سطح سے اُٹھا کر عشق الٰہی کے اس افق بلند تک اچھال بھی دیتا ہے۔ جو غیر محدود وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ تقویٰ سے اتصاف پذیر شخص کے سامنے اخلاقیات کا یہ اشکال نہیں رہتا کہ فائدہ و لذت کی بڑی سے بڑی مقدار کو کیونکر مرتکز کیا جائے۔ اِس کی طلب و آرزو کا ہدف یہ چیز قرار پاتی ہے کہ وہ کیا جتن اختیار کرے، جس سے زیادہ سے زیادہ محبت الٰہی کی نعمت کا سزاوار ٹھہرے۔ یعنی جس سے اِس کے اعمال میں حسن اور کمال اور نکھار اُبھر آئے۔ تقویٰ اسلامی نقطہ نگاہ سے عمل و کردار کی اساس بھی ہے، محرک و سرچشمہ بھی ہے اور روح و جان بھی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان کو اپنے ہر ہر اقدام و سعی سے پہلے سوچنا چاہیے کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے۔ اس کی تہہ میں کہیں نفس کی ادنیٰ خواہشات تو کارفرما نہیں، ریا اور دکھاوا تو اِس کا مقصود نہیں اور یہ بات تو نہیں کہ اعمال کے ظاہری حسن و کشش نے اِسے اس عمل پر آمادہ کیا ہو اور اِن اعمال کے باطن میں جو روح اور معنی پنہاں ہے اس سے اِس کی نظریں اوجھل ہوں۔ تقویٰ ہر ہر عمل میں دقت نظر اور حسن نظر چاہتا ہے۔

والسلام!

وحید احمد

محاسن اور معائب اخلاق

(خواجہ عبدالحکیم انصاری)

تمام محاسن اور معائب اخلاق کا مفصل بیان تو ممکن نہیں علاوہ ازیں بہت سی باتوں کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ اس لئے یہاں صرف وہ معدودے چند باتیں لکھی جاتی ہیں جو اجتماعی حیثیت سے قوم کی تعمیر یا تخریب کا باعث ہوتی ہیں لیکن ان محاسن و معائب کا بیان کرنے سے پہلے ہم ایک دفعہ پھر یاد دلانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے زوال کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا اخلاق قرآنی معیار سے بہت ہی زیادہ گرا ہوا ہے۔ اور جب تک وہ اخلاق میں معیاری ترقی نہ کریں دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے مقابلہ میں ہرگز سربلند نہیں ہو سکتے۔ محاسن اخلاق پر عمل کرنا ہی عین شرافت ہے۔ شرافت کا معیار اللہ تعالیٰ نے یہ بتایا ہے کہ جو آدمی جتنا زیادہ متقی ہے۔ یعنی جتنا زیادہ اللہ سے ڈرتا اور اس کے احکام پر عمل کرتا ہے اتنا ہی وہ شریف ہے۔ لیکن آج کل مسلمانوں نے شرافت کا معیار یورپ کی تقلید میں یہ قرار دے لیا ہے کہ جو جتنا زیادہ مالدار یا بڑا افسر ہے اتنا ہی وہ شریف ہے اس تخیل سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں اور کمزوری پیدا ہوگئی ہے اس نظریہ کو فوراً بدلنے کی ضرورت ہے۔

اب محاسن و معائب اخلاق کا حال سنیے۔

احسان

یہ وہی چیز ہے جس کو آج کل کی متمدن قومیں میوچول ہیلپ یعنی امداد باہمی کہتی ہیں۔ قرآن میں جابجا احسان کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ جو کوئی تمہارے ساتھ احسان کرے تم بھی اس کے ساتھ احسان کرو۔ مطلب یہ ہے کہ احسان کا سلسلہ ہر وقت جاری رہے احسان جماعت کی شیرازہ بندی اور اتحاد کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ احسان کے معنی صرف نیکی کے ہیں اور نیکی یہ ہے کہ جس شخص سے بھی کی جائے اس کو کچھ فائدہ یا کم از کم راحت و خوشی حاصل ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ جس جماعت کے سارے افراد ایک دوسرے کو ہر وقت آرام اور فائدہ پہنچانے کی کوشش میں لگے رہیں گے۔ اس جماعت کے ہر فرد کو حصہ رسدی کچھ کچھ آرام اور فائدہ ضرور پہنچتا رہے گا۔ اس طرح لوگوں کی بہت سی مشکلات میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ زندگی خوش گوار بن جائے گی۔ تنگیاں کشادگی سے بدل جائیں گی، جینے میں لطف آنے لگے گا اور یہ دنیا جیتے جی جنت بن جائے گی۔ اس سے دماغ میں سکون و یکسوئی پیدا ہوگی، عمل کی قوت بڑھے گی ہر

کام خوش اسلوبی سے کیا جا سکے گا اور ہر قدم پر کامیابی قدم چومے گی۔ لیکن بدنصیبی تو یہ ہے کہ آج کل احسان کو گالی سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ زبان میں بہت سے محاورے بھی ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ احسان کوئی بہت ہی بری چیز ہے مثلاً میری جوتی اس کا احسان اٹھاتی ہے۔ "میں تیرے باپ کا احسان مند نہیں ہوں"۔ "کسی کا احسان اٹھانے سے تو مر جانا بہتر ہے" حتیٰ کہ شاعر تک کہنے لگے کہ

احسان ناخدا کا اٹھائے میری بلا
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

احسان کی برائی کا خیال اس لئے پیدا ہوا کہ احسان کرنے والے احسان کے جتانے اور طعنے دینے لگے حالانکہ یہ نہایت ہی کمینہ پن کی بات ہے۔ اس طرح تو محبت و اخوت کے بجائے نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچتا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں کے ساتھ احسان کیا جاتا ہے اگر وہ اپنے محسنوں کے شکر گزار نہ ہوں اور احسان کے بدلے میں احسان نہ کریں تو وہ بھی سخت برائی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ احسان کرنے اور احسان اٹھانے والے دونوں کے دل میں محبت کا جذبہ کارفرما ہونا چاہیے۔ ورنہ قوم میں اتفاق و اتحاد کے بجائے نااتفاقی پیدا ہوگی اور فساد پھیلے گا۔ خوب سمجھ لو کہ جس قوم کے افراد صدق و خلوص سے ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے وہ قوم جانوروں سے بھی بدتر ہے کسی حالت میں بھی تباہی سے نہیں بچ سکتی۔ یہاں یہ بات اچھی طرح یاد رکھنی چاہیے کہ نیکی صرف نیکی کے لئے کی جائے کسی معاوضے یا بدلے کے لئے نہ کی جائے۔ ورنہ وہ دوکانداری بن جائے گی اور بجائے فائدے کے نقصان پہنچائے گی۔

ہم نے ایک انگلش میگزین میں ایک کتے کا ایک سچا واقعہ پڑھا۔ جس کو مالک نے سدھایا تھا۔ مالک روزانہ اس کے گلے میں ایک ٹوکری لٹکا دیتا۔ کتا یہ ٹوکری لے کر ایک بیکری میں جاتا اور وہاں سے کچھ رول لایا کرتا تھا۔ رول تعداد میں ہمیشہ پورے ہوتے تھے۔ ایک دن ایک رول کم نکلا اور اس کے بعد کئی دن تک ایک رول کم آتا رہا۔ آخر مالک نے بیکری والے سے دریافت کیا۔ اس نے کہا میں تو ہمیشہ پورے دیتا ہوں اس پر ایک دن جب کتا رول لے کر واپس جا رہا تھا۔ مالک نے چھپ کر اس کا تعاقب کیا کتا کچھ دور جانے کے بعد ٹھہر گیا۔ گلے سے ٹوکری نکال کر سڑک کے کنارے رکھی۔ اور ایک رول نکال کر منہ میں لیا اور بھاگا۔ یہاں تک کہ ایک دیوار

کے پیچھے غائب ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد واپس آیا تو منہ میں رول نہ تھا۔ کتے نے نوکری پھر گلے میں ڈالی اور گھر کی طرف چل دیا۔ جب وہ دور چلا گیا تو مالک دیوار کے پیچھے گیا، کیا دیکھتا ہے کہ وہاں کھنڈر میں ایک بہت ہی کمزور اور لاغر کتیا پڑی ہوئی ہے۔ جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہے۔ آس پاس سات نوزائیدہ پلے پڑے ہوئے ہیں۔ اور کتیا رول کھا رہی ہے دیکھا آپ نے جانوروں میں بھی یہ احساس ہے کہ ضرورت کے وقت اپنے ہم جنسوں کی مدد کریں۔ یا یوں کہیے کہ ترقی یافتہ قوموں کے کتے بھی ہم جنسوں کی مدد کرتے ہیں لیکن زوال پذیر قوموں کے آدمی بھی ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔

دیانت

دیانت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ دیانت سے صرف یہ مراد نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی کوئی چیز تمہارے پاس امانت رکھے تو اس کو بحسنہٖ واپس کر دو۔ دیانت یہ ہے کہ جس چیز پر تمہارا حق نہیں اس کو چھوؤ تک نہیں اور کسی طرح مل جائے تو ہرگز استعمال میں نہ لاؤ۔ دیانت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہارے توسل سے کسی کو کوئی پیغام بھیجے تو اس طرح پہنچاؤ کہ الفاظ اور لہجہ بھی بالکل ویسا ہی رہے، جو پیغام دینے والے کا تھا۔ دیانت یہ بھی ہے کہ تمام حقوق اللہ، حقوق نفسی اور حقوق العباد کو کما حقہ ادا کرو۔ دیانت یہ بھی ہے کہ اپنے فرائض منصبی کو پوری طرح ادا کرو۔ جتنے وقت تک کام کرنے کی تنخواہ یا اجرت ملتی ہے اس وقت میں اپنا یا کسی اور کا کوئی کام نہ کرو۔ کام بے دلی سے نہ کرو، خالی وقت نہ گزارو بیکار نہ ٹالو بلکہ اس کام کو جس کی اجرت ملتی ہے پورے جوش سرگرمی اور پوری قابلیت سے سرانجام دو۔ بعض متمدن ممالک میں دیانتداری کا یہ حال ہے کہ علی الصبح دودھ انڈے مکھن اخبار اور دیگر اشیاء بیچنے والے یہ چیزیں خریداروں کے دروازوں پر رکھ جاتے ہیں۔ کوئی دوسرا ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ غریب لوگ کسی چھوٹی سی دوکان یا کیبن میں کچھ سامان تجارت سجا کر ہر چیز پر اس کی قیمت لکھ دیتے ہیں اور خود دوکان کو خالی چھوڑ کر دن بھر کسی کارخانے وغیرہ میں کام کرتے ہیں، ضرورت مند خالی دوکان پر آتے ہیں، اور جو چیز لینی ہو اس کی قیمت کیش بکس میں ڈال کر چیز لے جاتے ہیں۔ شام کو مالک دوکان میں آ کر روپیہ نکال لیتا ہے۔ مجال ہے کہ کوئی شخص قیمت ڈالے بغیر کوئی چیز لے جائے۔ بعض اپاہج لوگ ایک کتا گاڑی بنا لیتے ہیں اور اس میں اخبارات یا اور ضروری چیزیں مثلاً سگریٹ وغیرہ رکھ دیتے ہیں۔ کتا سدھایا ہوا ہوتا ہے وہ بازاروں اور ؟؟وں میں گاڑی کو لئے پھرتا ہے لوگ ضروری چیزیں لے کر

قیمت کیش بکس میں ڈال دیتے ہیں۔ جب سامان ختم ہو جاتا ہے تو کتا گاڑی لے کر واپس گھر پہنچ جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہمارے ملک میں ایسا کیا جائے تو کیا حال ہو۔ پھر یہ دیکھئے کہ دیانت داری ان لوگوں میں ہے، جن کو مشرک و کافر کہہ کر آپ خوش ہو لیتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ مسلمان ہوتے ہوئے آپ کی دیانت داری کا کیا حال ہے۔

ایثار

ایثار و سخاوت تقریباً ایک ہی چیز ہے لیکن خیرات اور ایثار میں فرق ہے۔ خیرات یہ ہے کہ تمہارے پاس اپنی ضروریات سے جو کچھ فاضل ہو اس میں سے ضرورت مندوں کو بھی دو۔ لیکن ایثار یہ ہے کہ جو چیز تم کو محبوب ہو اور جس کی تمہیں خود ضرورت ہو وہ چیز کسی دوسرے ضرورت مند کو دے دو۔ یعنی اپنی ضرورت پر دوسروں کی حاجت براری کو مقدم سمجھو۔ ایثار ایک بہت ہی بلند مرتبہ صفات میں سے ہے اور ایثار کرنے والا اللہ تعالیٰ کو بہت ہی عزیز ہوتا ہے۔ قوم کی جہالت اور گراوٹ کی وجہ سے کئی صدیوں سے ایثار کے صحیح معنے بھی لوگوں کو معلوم نہیں رہے۔ اور ایثار اگرچہ کیا بھی جاتا ہے لیکن بہت ہی غلط جگہ اور غلط طریقے سے جب سے مسلمانوں میں بے عملی اور تن آسانی عام ہوئی ہے بے شمار لوگوں نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے کہ صاحب مقدرت اصحاب کے گرد اکٹھے ہو کر ان کی خوشامد اور چاپلوسی کرتے رہتے ہیں۔ اور وقتاً فوقتاً موقعہ دیکھ کر اپنی محتاجی اور افلاس کا حال موثر الفاظ میں بیان کر کے ان کے جذبہ ایثار و سخاوت سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کا ایثار قوم کو بجائے فائدے کے الٹا نقصان پہنچاتا ہے اور بے عمل مفت خوروں کی تعداد میں ہمیشہ اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لئے ایثار صرف مستحق آدمیوں کے ساتھ کرنا چاہیے۔ مفت خور خوشامدیوں اور حاشیہ نشینوں کی ہرگز ہرگز ہمت افزائی نہ کرنی چاہیے سب سے بہتر طریقہ ایثار کا یہ ہے کہ ایثار صرف اس موقعہ پر کیا جائے جبکہ اس سے اجتماعی فائدہ پہنچتا ہو۔ مثلاً قوم کے دو بڑے آدمی کسی ایک چیز کے حصول کے لئے مقابلہ کر رہے ہوں اور اس سے قوم کی دو جماعتوں میں دشمنی اور تفرقہ پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو ان میں سے ایک اپنے دعوےٰ سے بخوشی دست کش ہو جائے۔ تاکہ قوم میں پھوٹ نہ پڑنے پائے۔ قرن اول کے مسلمانوں میں یہ بات عام تھی لیکن آج ہمارے زعماء اس معاملے میں اپنے حریفوں کے ساتھ جس اخلاق کا ثبوت دیتے ہیں قارئین خود اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم کو تو بیان کرتے ہوئے ندامت محسوس ہوتی ہے۔ مفید ایثار کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ فرض کیجئے کسی شہر میں ایک کالج یا سکول وغیرہ کھولنا ہے لیکن اس کے لئے مکان

نہیں ملتا۔ اب کسی رئیس کے پاس ایک عالی شان اور فراخ کوٹھی ہے جو اسے بے حد محبوب ہے اور وہ اسی میں رہنا پسند کرتا ہے لیکن باوجود ازیں یہ کوٹھی کالج یا سکول کے لئے دے دے تو یہ ایثار واقعی فائدہ مند ہے۔ اور اللہ کی نظر میں مقبول ہم نے ایسے نواب اور رئیس بچشم خود دیکھے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان کی کسی چیز کی تعریف کر دے تو پھر وہ اس چیز کو اپنے قبضہ میں رکھنا معیوب اور خلاف شان جانتے ہیں اور تعریف کرنے والے کو بخش دیتے ہیں۔ امراء کی اس عادت کا سے قوم میں بے انتہاء بے عملی پیدا ہوتی ہے اور تن آسان مفت خورے ان کو بے وقوف بنا کر چھرے اڑاتے ہیں۔

ایفائے عہد

قومی ترقی کے لئے ایفائے عہد بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنی اور صفات حسنہ۔ قرآن میں آیا ہے: "یعنی اے ایمان والو اپنے اقراروں کو پورا کرو"۔ (سورۃ مائدہ) اس سے بھی بڑھ کر سورۃ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔ "یعنی اپنے وعدے پورے کیا کرو، قیامت میں اس کے متعلق باز پرس کی جائے گی"۔ لیکن یہاں اللہ اور قیامت پر ایمان ہی کسے ہے جو اس حکم کی پروا کرے۔ ایفائے عہد بڑی بڑی باتوں ہی میں نہیں، چھوٹی چھوٹی اور معمولی باتوں میں بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ بعض اوقات وعدہ خلافی کے نتائج بہت ہی برے ہوتے ہیں اور جس شخص سے وعدہ کیا جاتا ہے اس کو نہ صرف جسمانی اور روحانی اذیت بلکہ طرح طرح کا نقصان بھی پہنچتا ہے کم از کم ایک واقعہ ہم کو ایسا معلوم ہے جس میں ایک شخص نے محض اس لئے خودکشی کر لی تھی کہ اس کے ایک دوست نے جو روپیہ اس کو دینے کا وعدہ کیا تھا، حسب وعدہ وقت موعود پر ادا نہیں کیا۔ جس قوم کے افراد میں وعدہ خلافی کی عادت عام ہو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ وعدہ خلافی کرنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ وعدہ کیا ہی نہ جائے۔ دوسری قومیں جن کو تم کافر و مشرک کہہ کر خوش ہو لیتے ہو، ان کے معمولی افراد بھی ایفائے عہد میں اس قدر پکے ہوتے ہیں کہ ہماری قوم کے بڑے بڑے مدعیان تقویٰ، اعلیٰ تعلیم یافتہ اور زعماء بھی نہیں ہوتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اخلاق حسنہ اور اعلیٰ کردار انسانی پیدا کرنے کے لئے سب سے پہلا سبق ہی یہ ہے کہ آدمی وعدے اور وقت کی پابندی کرے۔

وجود باری تعالیٰ

محمد صدیق ڈار توحیدی

سوال :۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر ایک دوسرا انسان موجود ہوتا ہے؟

شیخ سلسلہ :۔ انسان کے اندر دوسرا انسان موجود نہیں ہے۔ بلکہ انسان روح اور جسم پر مشتمل ہے۔ روح پورے جسم کے اندر سرایت کئے ہوئے ہے۔ جسم کے سارے اعضاء روح کی خواہش کی تکمیل کی خاطر حرکت میں آتے ہیں۔ آپ کی حقیقت آپ کے اندر ہے۔ آنکھیں تو کیمرے کی مانند ہیں۔ بیرونی اشیاء سے روشنی منعکس ہو کر آنکھوں کے عدسوں سے گزرتی ہے اور اندرونی پردہ پر ان کا عکس بنتا ہے۔ اس عکس کو دیکھنے والی حقیقت تو اندر ہے۔ اسی طرح کان میں آواز کی لہریں جاتی ہیں اور ایئر ڈرم سے ٹکراتی ہیں۔ یعنی کان تو اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں لیکن سننے والی حقیقت اندر ہے۔ اسی طرح گرمی سردی کا احساس ہے۔ تمام جلد کے نیچے سینسر (Sensors) لگے ہوئے ہیں لیکن گرمی سردی نرمی سختی کا ادراک روح ہی کرتی ہے۔ جب آدمی کی موت واقع ہوتی ہے تو روح اس مادی جسم کو چھوڑ دیتی ہے اور اسے ایک نیا روحانی جسم مل جاتا ہے۔ جس طرح سانپ کچھ عرصہ کے بعد کینچلی بدلتا ہے۔ اس کے جسم کا اوپر والا غلاف اتر جاتا ہے اور اسے نئی جلد مل جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سمجھانے کے لئے عجیب وغریب قسم کے مثالی نمونے بنا رکھے ہیں۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سفیدے کا درخت ہے ہر سال اس کے پرانے چھلکے اتر جاتے ہیں اور اندر سے تروتازہ چمکدار سفید نیا درخت نمودار ہوتا ہے۔ عام درختوں کے ساتھ تو ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح روح نئے روحانی جسم کے ساتھ نکل جاتی ہے اس کی شکل وصورت بالکل آپ جیسی ہی ہوتی ہے چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو دوبارہ مادی جسم کے ساتھ اٹھانا ہے اس لئے روح کا تعلق اپنی قبر اور موت کے مقام کے ساتھ بدستور قائم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرما رکھا ہے کہ گلنے سڑنے کے عمل کی وجہ سے جو کچھ کم ہوتا ہے ہم جانتے ہیں۔ جب ہمارا حکم ہوگا تو بکھرے ہوئے تمام اجزاء پھر اکٹھے ہو جائیں گے اور مادی جسم اپنی اصل حالت میں آجائے گا۔

سوال :۔ سنا ہے کہ مکہ میں جو مناء کا میدان ہے وہاں حشر ہوگا؟

شیخ سلسلہ :- دیکھیں قرآن کریم میں آیا ہے کہ پہاڑ وغیرہ قیامت میں روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے اور بھربھری ریت بن جائیں گے اور زمین پر کوئی اونچ نیچ باقی نہ رہے گی۔ گویا پوری زمین ہموار میدان کردی جائے گی۔ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک پیدا ہونے والی مخلوق بھلا ایک میدان یا ایک شہر یا ملک میں کیسے سما سکتی ہے۔

تو انسان ایک ہے اور جنم بھی ایک ہی ہے۔ البتہ انسانی روح اللہ کی محبت کے سفر کے دوران لطافت کی منزلیں طے کرتی ہوئی مختلف روحانی طبقات سے گزرتی ہے۔ ان تبدیلیوں کو اگر نیا جنم سمجھا جائے تو علیحدہ بات ہے۔ ہندوؤں کے آواگون کے مسئلہ کو اگر صحیح مان لیا جائے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ سب سے پہلا جنم جو انسان کی صورت میں یا حیوان کی صورت میں ملا وہ کس انعام یا سزا کے نتیجے میں ملا اور اگر اعمال کے اختلاف کی بدولت انسان بار بار اس دنیا میں آتے رہتے ہیں تو پھر دنیا کی آبادی میں تبدیلی آنی چاہیے۔ کیونکہ وہی انسان بار بار یہاں آرہے ہیں۔ دیکھیں کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کسی شخص کو زندگی میں پہلی مرتبہ ملتے ہیں لیکن آپ کو لگتا ہے کہ آپ نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے حالانکہ نہیں دیکھا ہوتا۔ ایک حدیث شریف ہے کہ **الارواح جنود مجندۃ** ''یعنی عالم ارواح میں روحیں گروہ گروہ رہتی ہیں'' جو روحیں وہاں اکٹھی تھیں یہاں مانوس محسوس ہوتی ہیں۔ یہ ہے اس کی روحانی توجیہہ۔

ہمارے مرشد خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے سامنے ایک ہندو بار بار دنیا میں جنم لینے کا فلسفہ بیان کرنے لگا تو آپ نے فرمایا کہ یہ بالکل صحیح ہے اسی طرح ہوتا ہے۔ تو اس نے حیرانی سے کہا کہ مسلمان تو اسے نہیں مانتے آپ نے کیسے کہہ دیا کہ یہ درست ہے اس پر قبلہ حضرت نے فرمایا کہ ان بے چاروں کو اس کا پتہ نہیں۔ آپ یہ تو مانتے ہیں کہ روحیں بار بار اس لئے آتی ہیں کہ اچھے کام کر کے مکتی یعنی نجات حاصل کرسکیں اور جب ان کو مکتی ہو جاتی ہے تو پھر وہ واپس نہیں آتیں۔ ہمارا دین اسلام اس قدر کامل اور سچا ہے کہ ہر مسلمان کا ایک ہی پھیرے میں کام بن جاتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان کی نجات ایک ہی جنم میں ہو جاتی ہے اس لئے وہ بار بار کے جنم کے چکروں

کو نہ جانتے ہیں نہ مانتے ہیں۔

یہ تو ہمارا بھی عقیدہ ہے کہ گنہگار مسلمان جو دوزخ میں ڈالے جائیں گے وہ سزا بھگت کر اوپر والے طبقات میں ترقی کر جاتے ہیں۔ اور پھر آخر کار وہ بھی جنت میں داخل ہو جائیں گے۔ ان روحانی طبقات کی تبدیلی کو جنم کہنا چاہیں تو کہہ لیں لیکن دنیا میں پلٹ کر کسی کو نہیں آنے دیا جائے گا۔

اب یہ بدھ مذہب والوں کا سربراہ جسے وہ دلائی لامہ کہتے ہیں جب وہ مر جاتا ہے تو فوراً دوسرے جنم میں اس کی تلاش شروع کر دی جاتی ہے اور چالیس دن کے اندر ان کے روحانی بزرگ کشف کے ذریعے کسی نہ کسی بچے کو ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اور اسے اس کی خانقاہ میں رکھا جاتا ہے پھر یہ مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ یہ بچہ اپنے پہلے جنم میں استعمال کی جانے والی اشیاء سے رغبت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر کرے تو مان لیا جاتا ہے کہ یہ بچہ ہی دلائی لامہ ہے اور پھر پورے اعزاز و احترام کے ساتھ اس کی پرورش اور تربیت کی جاتی ہے۔ اب اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جس طرح ہپناٹسٹ مداری اپنے مشاہدات قوت خیال کے ذریعے اپنے معمول کے ذہن میں منتقل کر دیتا ہے اسی طرح لامہ کے اتالیق بھی اس کے ذہن میں یہ خیال ڈال سکتے ہیں کہ فلاں چیز کو پکڑو یا فلاں کمرے میں داخل ہو جاؤ۔ ایسا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح کئی مقامات اور انسان جو ہمیں دیکھے بھالے لگتے ہیں ممکن ہے وہ آپ نے روحانی طور پر پہلے دیکھے ہوں۔ اس لئے ایسی باتیں دوبارہ جنم کا ثبوت ہرگز نہیں ہیں۔ روح خواب یا نیم خوابی کی حالت میں پوری دنیا کا چکر لگا کر آ سکتی ہے مکہ شریف، مدینہ شریف اور کئی بزرگوں کی زیارت کر لیتی ہے۔ اور بعد میں کئی لوگ تصدیق کرتے ہیں کہ خواب میں بھی ایسا ہی دیکھا تھا۔ دراصل روح بسیط سے جب کوئی روح چل کر اس زمین پر مادی جسم کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے تو اس کا ایک سرا وہاں ہی قائم رہتا ہے اور وہاں سے مادی جسم تک ایک نورانی شعاع کا سلسلہ مسلسل قائم رہتا ہے۔ یہ بات قرآن کریم میں بھی لکھی ہوئی ہے کہ زمین میں کوئی جاندار نہیں ہے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی چوٹی سے پکڑ رکھا ہے ہند

ہوگی بھی اسے تسلیم کرتے ہیں اور وہ سر پر جو بودی یا چوٹی جو رکھتے ہیں وہ اسی مقام سے جڑی ہوتی ہے۔ اور بالوں کی چوٹی روحانی رابطے کے لئے ایک طرح سے انٹینا کا کام دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود جو کچھ انسان سے کروانا چاہتا ہے کسی خاص جگہ پر اسے پہنچاتا ہے، اس کا حادثہ ہوتا یا موت واقع ہوتی ہے تو اس کے لئے ہدایت و ترغیب اسی شعاع کے ذریعے آتی ہے یہ تقدیر الٰہی ہے۔ دوسری طرف آپ کے علم تجربہ اور اعمال سے بھی یہ شعاع متاثر ہو کر منور یا مکدر ہوتی رہتی ہے یہ انسانی تدبیر ہے۔

ہمارے مرشدؒ نے تعمیر ملت میں روح کی ماہیت سمجھانے کے لئے سینما سکرین کی مثال دی ہے وہاں اصل فلم تو آپریٹر کی مشین میں ہوتی ہے لیکن روشنی کی شعاؤں پر سوار ہو کر اور ہال کی فضا سے گزر کر سامنے سکرین پر جلوہ گر ہوتی ہے اور وہاں زندہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آپریٹر روم سے لے کر سکرین تک جو نور کی بیم ہوتی ہے اس کے ہر مقام پر وہ تصویر موجود ہوتی ہے آپ جہاں بھی سکرین رکھ دیں وہاں ہی تصویر نظر آ جائے گی بس سائز کا فرق ہوگا۔ اسی طرح آپ کی شعاع میں بھی ان گنت روحانی اجسام یا ہمزاد موجود ہوتے ہیں۔ جب موت واقع ہوتی ہے تو مادی جسم تو یہاں ہی رہ جاتا ہے اور اس کے قریب والا پہلا روحانی جسم اس کی جگہ لے لیتا ہے اور عالم بالا یا روحانی عالم یا عالم مثال کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اس کی رفتار اور مقام کا انحصار انسان کے اعمال پر ہوتا ہے۔ دنیا کی محبت اور اس کے گناہ بوجھ بن کر اسے نیچے کھینچتے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اور صالح اعمال اسے اوپر اٹھاتے ہیں۔ ان دونوں کی کشمکش کے نتیجے میں روح جہاں تک پہنچ سکتی ہے چلی جاتی ہے اور قیامت تک اسی مقام میں ٹھہرائی جاتی ہے۔ نیک لوگوں کی روحیں اتنی طاقتور ہوتی ہیں اور اتنی رفتار سے دوزخ کے طبقات میں سے پار ہو کر جنت میں پہنچ جاتی ہیں کہ انہیں دوزخ کی گرمی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ گنہگاروں کی روحیں دوزخ کے کسی طبقے میں جا کر رک جاتی ہیں۔ کافروں اور انتہائی برے انسانوں کی روحیں پرواز کر ہی نہیں سکتیں اور مادے ہی میں پھنسی رہتی ہیں۔

یہ ہے مختصر سا تعارف روحانی نظام کا۔ جب آپ سو جاتے ہیں تو آپ کی روحانی شعاع جو کہ انتہائی لچکدار اور تیز رفتار ہوتی ہے دنیا کا چکر لگا کر واپس آ جاتی ہے۔ جو کچھ وہ دیکھتی ہے بیدار ہونے پر آپ کو اکثر یاد ہوتا ہے۔ خواب کے دوران کوئی دوسرا جسم یا دوسری روح آپ کے جسم سے نہیں نکلتی۔ اسی طرح نیک لوگوں کی روحانی شعاع میں روحانی اجسام یا ہمزاد ہوتے ہیں جو بیدار ہو جاتے ہیں۔ تو ان کے اردگرد کی خلاء میں عالم امر سے جو احکام زمین کی طرف نازل ہو رہے ہوتے ہیں وہ انہیں نظر آ جاتے ہیں۔ سارے عالم کا علم نہیں ہوتا ہر روح کو اپنے اپنے ماحول کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ نیند میں شعور سو جاتا ہے اور لاشعور جاگ اٹھتا ہے اس طرح روحانی عالم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ مجذوب لوگ جاگتے ہوئے بھی اسی کیفیت میں رہتے ہیں اس لئے انہیں آئندہ ہونے والے بعض واقعات کی جھلک نظر آ جاتی ہے۔ اللہ والے فقیر لوگ اپنی قوت ارادی سے شعور کو معطل کر کے روحانی عالم میں جھانک سکتے ہیں۔ کسی آنے والے کے دل کی بات معلوم کر سکتے ہیں۔ اس کے ماضی کو پڑھ سکتے ہیں اور اس کے مستقبل کے بارے میں جان سکتے ہیں۔ اسی کے بارے میں بزرگوں کے تذکروں میں لکھا ہوتا ہے کہ انہوں نے لوح محفوظ پر نظر ڈالی اور سائل کو بتا دیا کہ فلاں چیز تمہاری قسمت میں ہے یا نہیں۔ سب پیش گوئیوں کی سائنس یہی ہے کہ یہ لوگ مختلف مشقوں کے ذریعے لاشعور کو جگانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے احکام کی جھلک دیکھ لیتے ہیں۔

ایک بزرگ ولی نعمت اللہ شاہ کی سینکڑوں برس پہلے لکھی ہوئی پیشگوئیاں فارسی نظم کی صورت میں موجود ہیں۔ اس میں ہند پر انگریزوں کی حکمرانی، پاکستان کا وجود میں آنا اور دیگر کئی واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ اخباروں میں کبھی کبھی آتی رہتی ہے۔ اسی طرح فرانس کے ایک ناسٹرڈیمس کی صدیوں پہلے لکھی ہوئی پیشگوئیاں کا ذکر بھی اخباروں میں آتا رہتا ہے۔ نوائے وقت میں میجر (ر) معین باری صاحب اس کے بارے میں لکھتے رہتے ہیں۔

اجر اور ثواب

حاجی مبارک علی

اجر اور ثواب دو مختلف لفظ ہیں لیکن اجر کے معنی ثواب کر دیا گیا۔ یعنی آپ کوئی نیک کام کریں اسکا ثواب ہوگا کب ہوگا؟ قیامت کے دن ہوگا۔ یعنی ہماری سوچوں کا دھارا موڑ کر قیامت کے دن پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جس سے ہماری سوچوں میں ایک مبہم سی امید رہ جاتی ہے جب قیامت آئے گی تب دیکھا جائے گا۔ ثواب کیا ہے؟ ہوتا بھی ہے یا نہیں؟ یعنی اس سے بے عملی، سستی، کم ہمتی اور بے عقیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر لفظ اجر کو جو کہ اجرت سے نکلا ہے۔ اسکو مزدوری کے معنی پہنا دیئے جائیں یعنی کوئی بھی نیک عمل کریں تو اسکی فوری مزدوری ملتی ہے۔ تو قیامت کے ثواب کا نظریہ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں حکم دیتا ہے کہ مزدور کو پسینہ خشک ہونے سے پہلے اسکی مزدوری ادا کر دو۔ ہمیں تو یہ حکم دے اور خود ہمارے نیک کاموں کا ثواب قیامت کو دے۔ یہ بات بہت معیوب سی ہے۔ یہ بات قانون قدرت کے بھی خلاف ہے اور سائنس کی رو سے بھی۔ کیونکہ بمطابق نیوٹن کے تیسرے کلیے کے مطابق ہر عمل کا ردعمل ہے۔ اس میں دیر نہیں ہے، فوری ہے۔ حیات آخرت اور جزاء وسزا پر ایمان رکھنا دین کا اہم رکن ہے لیکن اچھے اور برے اعمال کے اثرات اس دنیا میں بھی مرتب ہوتے ہیں۔ قرآن کریم ایمان کی برکتوں اور کفر و نفاق کی نحوستوں کا بار بار ذکر کرتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہمارے پیش نظر رہے تو ہمارے ہر نیک عمل میں پختگی پیدا ہوگی۔ خدمت خلق کا ولولہ عام ہو جائے گا، نیکی اور عبادات کا ذوق وشوق بڑھے گا۔ پھر سے تعمیری کاموں میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فضا پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح مسلمان عمل کی دنیا میں اتر آئیں گے۔ ایک امید کی کرن پیدا ہو جائے گی کہ قرون اولیٰ والے دن واپس آجائیں گے۔ کیونکہ جب تک ہمارا اخلاق و کردار نہ بدلے گا تب تک امت اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل نہیں کر سکتی۔

یہی میرا موضوع بحث ہوگا۔ میں دین کے چند بڑے ارکان کی نشان دہی کرونگا۔ اور ثابت کرنے کی کوشش کرونگا کہ ہمارا دین بالکل نقد تھا اور یہی ہمارے اعمال کی اساس تھی۔ جس کو ہم نے کھو دیا اور مسلمان عمل سے فارغ ہو کر آج ذلیل وخوار ہو رہا ہے۔

اگر مسلمان آج بھی عمل کی دنیا میں اتر آئے اور عمل کرے تو اس کو پتہ چلے کہ واقعی مزدوری

نقد ملتی ہے اور ہر عمل کا ردِ عمل ہے۔ تو کھوئی ہوئی قدریں واپس آ سکتی ہیں۔ اور مسلمان اس دنیا میں عزت کی زندگی گزارنے کا اہل ثابت ہو سکتا ہے۔ دعا کریں کہ ایسا ہو۔

کلمہ طیبہ کے بعد ارکان دین میں نماز ہر روز ادا کئے جانے والا سب سے بڑا رکن ہے۔ اس کے بارے میں قرآن حکیم میں حکم ہوتا ہے۔

ترجمہ: ''تو پڑھ جو اتری تیری طرف کتاب اور کھڑی رکھ نماز، بے شک نماز روکتی ہے بے حیائی سے اور بری بات سے، اللہ کی یاد ہے سب سے بڑی اور اللہ کو خبر ہے جو کرتے ہو''۔

حقیقی نماز کے بارے میں بلا خوف وتردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے اور اس کے اثرات کا عملی مشاہدہ زمانہ حال کی بات ہے کہ ادھر نماز پڑھو ادھر بے حیائی اور برے کاموں سے روکے گی۔ اگر کسی نمازی پر ایسا اثر نہیں ہوتا۔ تو اس نمازی کے نماز پڑھنے میں ضرور کوئی کوتاہی ہوگی۔ ورنہ تو اللہ کا فرمان غلط قرار پائے۔ ہم نے نماز کی روحانی لطافت کو نظر انداز کر کے اس کو کیا رنگ دیا ہے۔ کہ مسجد میں نماز پڑھو تو ستائیس نمازوں کا ثواب ہوگا۔ مدینہ شریف میں پڑھو تو پچاس ہزار نمازوں کا ثواب ہوگا اور اگر خانہ کعبہ میں پڑھو تو ایک لاکھ نماز کا ثواب ہوگا۔ ہم نے گناہوں سے اور شرک کے اندھیروں سے بچانے والی نماز کی بے مثال روحانی طاقت کی پروانہ کی اور اسکی فوری نورانیت کی نقد مزدوری کو پھر قیامت پر اٹھا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ اللہ کا فرمان ہے کہ اس کا فوری اثر ہوتا ہے۔ جو لوگ خشوع وخضوع اور حضوری قلب سے نماز ادا کرتے ہیں ان کو پتہ چلتا ہے کہ اکیلے نماز ادا کرنے کا کیا اثر ہے۔ باجماعت ادا کرنے سے روحانی طاقت اور لطافت میں جو اضافہ ہوتا ہے ان کا قلب اسے محسوس کرتا ہے۔ اسی طرح وہ یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ مدینہ منورہ میں نماز ادا کرنی کتنی بابرکت ہے اور خانہ خدا میں کیا انوار وتجلیات انسان پر وارد ہوتی ہیں۔ یہ اجر بالکل نقد ہے بشرطیکہ انسان اپنے آپ کو ان باتوں کا اہل ثابت کرے یعنی اسے صحیح طریقہ سے نماز ادا کرنی آ جائے۔ حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ ''نماز نہیں ہوتی مگر حضوری قلب کے ساتھ''۔

اب اللہ کی راہ میں جہاد کی فضیلت دیکھئے کہ بیعت رضوان کرنے والے کو دنیا ہی میں اللہ تعالیٰ کی رضا کی سند عطا کر دی گئی۔ اور جن صحابہ کرامؓ نے جنگ بدر میں حصہ لیا ان کو اللہ تعالیٰ نے بشارت دے دی کہ وہ جنتی ہیں۔ اب یہ ایک قانون بن گیا کیونکہ ہر ایک کا تو اللہ تعالیٰ نام نہیں لیتا۔ جو مسلمان بھی فضائے بدر اور جذبہ حدیبیہ لے کر جہاد کرے گا وہ یقیناً جنتی ہے۔ کیا یہ فوری بشارت اور نقد انعام نہیں ہے؟

اسی طرح قرآن میں ذکر الٰہی کے بارے میں ارشاد ہوا کہ اس سے دل اطمینان پاتے ہیں۔
ہمارے توحیدی بھائی تو ذکر کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں کہ روزانہ کے ذکر میں کتنے نقد انعامات ہیں۔ مثلاً مزا آنے لگتا ہے، دل میں سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے، عبادات میں دل لگنے لگتا ہے، اللہ کی یاد انسان کے اندر ٹھاٹھیں مارنے لگتی ہے، برائیوں سے بندہ بچنے لگتا ہے اور نیکی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔ کیا یہ سارے نقد انعامات نہیں ہیں۔

یاد الٰہی

یاد الٰہی سے یاد آیا کہ اللہ پاک قرآن حکیم میں فرماتے ہیں:
ترجمہ: ''پھر لقمہ کیا اسکو مچھلی نے، اور وہ الاہنا کھایا تھا، پھر اگر نہ ہوتا کہ وہ علیہ تھا یاد کرتا پاک ذات کو تو رہتا اسکے پیٹ میں جس دن تک مردے جیویں''۔
یعنی قیامت تک حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں رہتے۔
کیا یہ یاد الٰہی کا نقد انعام نہیں ہے؟ کہ مچھلی یاد الٰہی میں رہنے والے انسان کو ہضم نہ کر سکی۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے ساحل پر اگل دیا۔

تفرقہ بازی

یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اور کفار نے اس موضوع پر مسلمانوں کے خلاف بہت کام کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تفرقہ بازی سے منع فرمایا ہے۔ ویسے تو ہمارا دین سارے کا سارا اخوت و بھائی چارے پر مبنی ہے۔ پوری انسانیت کو کلمہ طیبہ کی بنیاد پر ایک امت بننے کی دعوت دیتا ہے۔ چنانچہ آل عمران 103 میں حکم ہوا ہے۔
ترجمہ: ''اور مضبوط پکڑو رسی اللہ کی سب مل کر اور پھوٹ نہ ڈالو''۔
یہ ارشاد کئی جگہ قرآن حکیم میں آیا ہے اسی سورۃ کی آیت نمبر 113 تا 114 میں بھی ہے۔ مسلمان بھائی مسلمان کے خلاف چوری بات نہیں کر سکتا یعنی مسلمان بھائی کی چغلی کھانا بھائی کا گوشت کھانے کے برابر ہے۔ الانعام 160 کے صرف ترجمہ پر اکتفا کرتا ہوں:
ترجمہ: ''جنہوں نے راہیں نکالیں اپنے دین میں ہو گئے کئی فرقے۔ تجھ کو ان سے کچھ کام نہیں، ان کا کام حوالے اللہ کے، پھر وہی جزا دیگا جو کچھ وہ کرتے تھے۔
الانعام 65 میں ارشاد ہوا ہے:
ترجمہ: ''تو کہہ اسی کو قدرت ہے، بھیجے عذاب تم پر اوپر سے اور پاؤں کے نیچے سے، یا

ٹھہرائے تم کو کئی فرقے کر کر، چکھاوے ایک کو لڑائی ایک کی، دیکھ ہم کس پھیر سے کہتے ہیں باتیں شاید وہ سمجھیں''۔

یعنی فرقہ بازی کو بہت بڑا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کی ان سب آیات کو ایک حدیث کے ذریعے سے ملیامیٹ کر دیا گیا ہے۔

حدیث: یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کے (72) (72) فرقے ہونگے اور مسلمانوں کے 73 فرقے ہونگے۔ یہ حدیث سراسر قرآن حکیم کے خلاف جاتی ہے یہاں مسلمانوں کو مل جل کر رہنے کا حکم تھا۔ مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے حکم اور قرآنی تعلیم کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے لاتعداد فرقے بن گئے ہیں۔ میری نظر سے ایک کتاب گزری جس میں مسلمانوں کے ہزاروں فرقوں کی لسٹ تھی مزے کی بات یہ ہے کہ اس میں جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کا کوئی فرقہ درج نہ تھا۔ میں نے چند مولوی صاحبان سے پوچھا کہ بھائی قرآن حکیم تو فرقہ بازی کی مذمت کرتا ہے۔ یہ حدیث تو خلاف جاتی ہے تو انہوں نے متفقہ طور پر جواب دیا کہ یہ حضور ﷺ کی پیشگوئی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ حضور ﷺ کی پیشگوئی ہے بھی یا کہ نہیں۔ حضور ﷺ کی غلاموں کی پشین گوئیاں تو تقریباً ساری کی ساری سو فیصد پوری ہو جاتی ہیں۔ مثلاً شاہ ولی اللہؒ، داتا گنج بخشؒ، سچل سرمستؒ وغیرہ۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے کہ 73 فرقے ہونگے اور ہو جائیں 7300 یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ حدیث گھڑی اس لئے گئی ہے کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا جائے۔ (واللہ العلم)

پھر ہمارا یہود و نصاریٰ سے مقابلہ تو نہیں ہے کہ انہوں نے 72 فرقے بنائے تو ہمارا ایک فرق ان سے زیادہ ہونا بہت ضروری ہے کہ کہیں ہم مقابلہ میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ انہوں نے جدید سائنس میں اتنی ترقی کی ہے۔ اس کے مقابلہ میں تو ہم کوشش نہیں کرتے، جن باتوں سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے اس میں ہم معاون بن جاتے ہیں۔ آخر پر ایک آیت درج کرتا ہوں شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے میری بات۔

ترجمہ: ''اور حکم مانو اللہ کا اور اسکے رسول ﷺ کا، اور آپس میں نہ جھگڑو پھر نامرد ہو جاؤ گے اور جاتی رہے گی تمہاری باؤ، اور ٹھہرے رہو اللہ ساتھ ہے ٹھہرنے والوں کے۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر محدث دہلوی)

اب آپ اس آیت کریمہ کے ترجمہ کو مدنظر رکھ کر اپنے اردگرد کے ماحول پر غور کریں۔ کہیں

ہم نامرد تو نہیں ہو گئے؟ (نوٹ: ایک ترجمہ میں نامرد کی بجائے بزدل ترجمہ کیا ہے۔ بات تقریباً ایک ہی ہے)

میرے خیال میں ہم مکمل طور پر نامرد ہو گئے ہیں اور نامرد بے غیرت بھی ہوتا ہے۔ غیرت تو یہ تھی کہ ایک لڑکی کی پکار پر ہندوستان پر حملہ کر دیا گیا تھا اور آج مسلمان عورتوں کی لاکھوں کی تعداد میں عصمت دری ہوتی ہے اور ہمارے کان پر خارش تک نہیں ہوتی۔ نامرد آدمی کسی میدان کا نہیں ہوتا اسکی باؤ یعنی رعب نہیں رہتا۔ اسکی کہیں شنوائی نہیں ہوتی، نہ اسکی بات مانی جاتی ہے اور نہ نامرد آدمی جہاد کر سکتا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور کفار ہم سے کسی لحاظ سے افضل اور بہتر نہیں ہیں لیکن ہمیں تفرقہ بازی نے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ جہاد کے لئے جن جذبات کی ضرورت تھی ان کی جگہ تفرقہ بازی نے لے لی ہے۔ ہم آپس کے جھگڑوں اور قتل و غارت میں لگ گئے ہیں۔ ایک تو تفرقہ بازی ہی کو اللہ تعالیٰ نے عذاب قرار دیا ہے دوسرے اسکی سزا بھی ملے گی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "اور جو کوئی مارے مسلمان کو قصد کر کے، تو اس کی سزا دوزخ ہے، پڑا رہے اس میں اور اللہ کا اس پر غضب ہوا۔ اور اس کو لعنت کی، اور اسکے واسطے تیار کیا بڑا عذاب"۔

اب جیسے ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ بدری صحابہ کرامؓ کو بشارت مل گئی کہ وہ سب جنتی ہیں۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی پختہ یقین ہونا چاہیے کہ یہ دوزخ اور اس میں پڑے رہنا اور بڑے عذاب میں مبتلا ہونا ہے۔ کیا یہ ساری باتیں یعنی ساری برائیوں کا نقد انعام نہیں ہے؟

اگر امت مسلمہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کو مضبوطی سے پکڑے، دین اسلام کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لے، اپنے کردار کو اللہ کے حبیبؐ کے سانچے میں ڈھال کر دنیا کے لئے سراپا رحمت بن جائے تو پھر سے اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت اسے حاصل ہو جائے گی۔ خالی دعووں اور دعاؤں سے کام نکلنے کا نہیں ہے۔ خیر القرون کا نمونہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسے اپنائے بغیر ان جیسے مقام کے حصول کی آرزو خیال خام ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں کو نہیں بلکہ قلوب اور اعمال کو دیکھتا ہے۔ بقول اقبالؒ:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

آٹھ باتیں

محمد رفیق نقشبندی

امام احمد ابن حنبلؒ کے زمانے میں ایک بزرگ تھے ان کا نام حاتم الاصم تھا، بڑے ہی نیک اور سمجھدار آدمی تھے۔ ان کے استاد حضرت شفیقؒ اپنے زمانے کے مانے ہوئے عالموں میں سے تھے، حضرت حاتم الاصم 33 سال تک ان کی تربیت میں رہے اور بہت کچھ سیکھا، ایک دن حضرت شفیقؒ نے حاتم سے پوچھا۔

استاد: کیوں بھئی حاتم تم کتنے دنوں سے میرے ساتھ ہو؟۔

طالب علم: جناب 33 سال ہو گئے۔

استاد: اچھا یہ بتاؤ اتنے دنوں میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا؟

طالب علم: استاد محترم صرف آٹھ باتیں سیکھیں۔

استاد: ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' تم نے ساری عمر میرے ساتھ بتا دی اور صرف آٹھ باتیں سیکھیں۔

طالب علم: استاد محترم! جھوٹ بولنا تو میں پسند نہیں کرتا واقعی میں نے تو آپ سے صرف آٹھ باتیں سیکھیں۔

استاد: اچھا لاؤ سناؤ کیا آٹھ باتیں تم نے سیکھی ہیں؟

طالب علم نے کہنا شروع کیا

پہلی بات: استاد محترم! جہاں تک میں نے دنیا پر نظر ڈالی میں نے دیکھا کہ ہر آدمی کسی نہ کسی کو اپنا محبوب بنائے ہوئے ہے اور اس سے محبت کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ مر جاتا ہے اور قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے، لیکن اس کا وہ محبوب اسے قبر میں اکیلا چھوڑ دیتا ہے، پس میں نے صرف نیکیوں کو اپنا محبوب بنایا کہ یہ قبر میں بھی میرے ساتھ رہیں گی اور مجھے کہیں اکیلا نہ چھوڑیں گی۔

استاد نے شاباش دی اور کہا اچھا حاتم دوسری بات بتاؤ۔

دوسری بات: حاتم نے کہا استاد محترم میں نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہمیشہ اپنے سامنے رکھا۔

ترجمہ: ''اور جو اپنے رب کے حضور حاضری سے ڈرتا ہوا اور اپنے آپ کو بری خواہشوں سے روکتا رہا اس کا ٹھکانہ جنت ہے''۔

اور مجھے پورا یقین ہوگیا کہ اللہ میاں نے بالکل سچ فرمایا ہے۔ پس میں نے بری خواہشات سے بچنے کی پوری پوری کوشش کی اور جی جان سے اپنے خدا کی بندگی میں لگ گیا۔

حضرت شفیقؒ بہت خوش ہوئے اور کہا عزیز تیسری بات کیا ہے؟

حضرت حاتم نے کہا

تیسری بات: استاد محترم! دنیا والوں کی حالت پر جہاں تک غور کیا یہی نظر آیا کہ جس کے پاس بھی کوئی اچھی اور قیمتی چیز ہے وہ اسے حفاظت سے رکھتا ہے.... پھر میری نظر سے یہ آیت گزری۔ (ترجمہ) ''جو کچھ تمہارے پاس ہے (ایک دن) ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے گا''۔

اب یہ حال ہے کہ جو اچھی چیز بھی میرے ہاتھ لگتی ہے اسے اللہ کے حوالے کر دیتا ہوں، کیونکہ میرے پاس رہے گی تو فنا ہو جائے گی اللہ کے یہاں رہے گی تو ہمیشہ ہمیشہ میرے لئے باقی رہے گی۔

چوتھی بات: استاد من! میں نے مخلوق کی حالت پر جہاں تک غور کیا یہ دیکھا کہ کوئی مال اور شان و شوکت کے پیچھے لگا ہوا ہے اور کوئی نسب اور دنیوی شرافت پر بچھتا ہے، لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ سب چیزیں کوئی وزن نہیں رکھتیں، قرآن شریف کی یہ آیت میرے سامنے آئی۔ (ترجمہ) ''تم لوگوں میں جو سب سے زیادہ برائی سے بچنے والا اور نیکیاں کمانے والا ہے وہی اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے''۔

اور میں نے برائیوں سے بچنے کے لئے کمر باندھ لی تاکہ خدا کے یہاں عزت والا بنوں۔

پانچویں بات: استاد محترم! دنیا والوں کے حالات پر جہاں تک میں نے سوچا یہی پایا کہ کوئی کسی کو لعنت ملامت کر رہا اور کوئی کسی کو برا بھلا کہہ رہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ان سب پاپوں کی اصل جڑ ''حسد'' ہے پھر میں نے خدا کے اس فرمان پر غور کیا۔ (ترجمہ) ''ان لوگوں کو دنیا کی زندگی کا ساز و سامان ہم ہی نے اپنی مصلحت کے مطابق دیا ہے''۔ (الزخرف 32)

اور میں نے حسد سے بچنے کا پختہ ارادہ کر لیا۔ لوگوں سے بے پروا ہو گیا اور پھر کبھی حسد اور جلن کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیا، اور مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ دنیا کے ساز و سامان اور مال و دولت کی یہ تقسیم تو اس خدا نے کی ہے جو برے جذبات اور بے جا جھکاؤ سے پاک ہے اس کے بعد پھر بھی

میں نے کسی سے دشمنی نہیں کی۔

چھٹی بات: استاد محترم! لوگوں کے حالات پر میں نے جہاں تک نظر ڈالی یہی دیکھا کہ کوئی کسی پر زیادتی کر رہا ہے اور کسی کی کسی سے ٹھنی ہوئی ہے، چنانچہ میں نے سب سے ہٹ کر خدا کے اس فرمان کو لیا۔ (ترجمہ) ''بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے اور تم اس کو اپنا دشمن سمجھو''۔

اور پھر میں نے اس عدو مبین سے بچنے کی کوشش کی، صرف اسی سے دشمنی ٹھانی اور کسی کو اپنا دشمن نہ سمجھا کیونکہ خدا نے اسی کو دشمن ٹھہرایا ہے۔

ساتویں بات: پھر حاتم نے کہا استاد محترم! میں نے جہاں تک دنیا والوں پر نظر دوڑائی دیکھا کہ چند ٹکڑوں کی طلب میں ہر ایک لگا ہوا ہے، اسی کے لئے ہر طرح کی ذلت اوڑھتا ہے اور لالچ میں حلال حرام کی کوئی پروا نہیں کرتا، پھر میں نے خدا کی آیت پر غور کیا۔ (ترجمہ) ''زمین پر چلنے پھرنے والے ہر جاندار کی روزی اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ آخر میں بھی تو زمین پر چلنے والے ان جانداروں ہی میں سے ہوں جن کی روزی کا ذمہ اللہ نے لیا ہے، چنانچہ پھر میں بھی اس چیز کی فکر میں نہیں پڑا جو اللہ کے یہاں سے بہر حال مجھے ملنے والی ہے، اور ہر طرف سے بے پروا ہو کر یکسوئی کے ساتھ ان تمام حقوق کو ادا کرنے لگ گیا جو مجھ پر واجب ہیں۔

آٹھویں بات: استاد محترم! آخری بات یہ ہے کہ لوگوں کے حالات پر جہاں تک میں نے سوچا یہی معلوم ہوا کہ ہر ایک نے بودی اور کمزور چیزوں پر بھروسہ کر رکھا ہے، کوئی مال اور سامان پر بھروسہ کئے ہوئے ہے، کوئی اپنی کاریگری پر، کوئی اپنی صحت و قوت پر، غرض انسان اپنے ہی جیسے انسانوں پر تکیہ کئے ہوئے ہیں، یا اپنی حقیر قوتوں پر..... یہ حالت دیکھ کر میں نے خدا کے اس فرمان کو دل سے لگایا۔ (ترجمہ) ''اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے''۔

پس میں نے ہر چیز سے نظر ہٹا کر صرف خدا پر بھروسہ کیا اور واقعی خدا میرے لئے کافی ہے۔

شاگرد کی یہ سچی ایمان افروز باتیں سن کر حضرت شفیقؒ بہت خوش ہوئے لائق شاگرد کو علم و عمل اور ترقی کی دعائیں دیں اور فرمایا میں نے تورات، انجیل پر بھی غور کیا، زبور اور قرآن شریف پر بھی خوب خوب غور کیا، حاتم آسمانی کتابوں کا خلاصہ یہی آٹھ باتیں ہیں۔

میں کیسے مسلمان ہوا

محمد صدیق ڈار توحیدی

یہ ایک امریکن کی سرگزشت ہے جس کے والدین امریکہ ہی میں پیدا ہوئے لیکن اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے اس پر کرم فرما کر اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمایا۔ اب میرا نام عبداللہ ہے۔ اسلام لانے سے قبل میں نہایت ہی گمراہ بے چین اور پریشان انسان تھا۔ میں اپنے معاشرے اور پوری دنیا کے بارے میں مایوسی کا شکار تھا۔ بچپن میں مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے مجھے کیتھولک سکول میں داخل کر دیا گیا۔ بلوغت تک پہنچنے پر میرے اساتذہ، پادریوں، پڑوسیوں اور والدین کی نفاق بھری زندگی نے مجھ پر ایسا رنگ چڑھایا کہ میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ انتہائی مکار اور دھوکے باز انسان بننا ہی زندگی کا اصل مقصود ہے۔ اگرچہ اس وقت بھی میں اللہ تعالیٰ کے وجود پر ایمان رکھتا تھا لیکن میرا عقیدہ درست نہ تھا۔ اس لئے میں نے شیطان کے بہکانے پر خود ہی کئی عقیدے گھڑ لئے تھے۔ مثلاً یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کو بھیڑ بکریوں کا ذبح کیا جانا منظور نہ ہوتا تو وہ انہیں بھیڑ بکریاں نہ بناتا۔ تاہم میری روح زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا نہ کر سکی اور مجھ پر ذہنی انتشار اور پریشانی کے بادل چھا گئے اور کئی بار تو خودکشی کر لینے کا خیال بھی آیا۔ اسی کیفیت میں سال گزرتے رہے۔ مجھی ملازمت مل گئی، میں نے شادی کر لی اور میرا ایک بیٹا بھی ہو گیا اور میں نے ایک مکان بھی خرید لیا۔ لیکن روح کی بے چینی برقرار رہی۔ ایک ایسی سوسائٹی نے جس کا ہر فرد دوسرے فرد کو پشت پر وار کرنے کے لئے تلا ہوا تھا گویا کتے کتوں کا شکار کر رہے تھے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اپنے خدا سے مدد مانگوں کہ مجھے حقیقت سے آشنا فرمادے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے میری التجا منظور فرمالی اور ایک فلسطینی مسلمان نے میرے مکان کا ایک حصہ کرایہ پر لے لیا۔ ہم بہت جلد دوست بن گئے اور مذہب ہمارا پسندیدہ موضع گفتگو بنتا چلا گیا۔ اس سے پہلے بلیک مسلم تحریک کی وجہ سے میرا خیال یہ تھا کہ صرف کالے لوگ ہی مسلمان ہوتے ہیں اور وہ گوروں سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ بات تو مجھے بعد میں معلوم ہوئی کہ یہ لوگ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود بھی مسلمان ہرگز نہیں ہیں۔ کیونکہ اس گروہ کا عقیدہ یہ تھا کہ حضرت محمد ﷺ کے بعد عالیجاہ محمد کو اللہ تعالیٰ نے کالے لوگوں کے لئے اپنا نبی بنایا ہے میں نے

ٹیلیویژن پر حج کے کچھ مناظر بھی دیکھے۔ جس میں شیاطین کو پتھر مارنے کا نظارہ مجھے فضول سا لگا
اور میں نے دل میں کہا کہ میں ان لوگوں کی طرح بے وقوف نہیں ہوں۔ میں نے اپنے
احساسات سے فلسطینی کو آگاہ کیا جس نے حتی الامکان مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

فلسطینی دوست سے ملاقات کے تین برس بعد میں نے اسے بتایا کہ وہ مجھے مسلمان بنانے
کی کوشش ترک کر دے کیونکہ دل سے مان لینے کے باوجود بھی میں صحیح طور پر نماز، روزہ، حج اور
زکوۃ کے تقاضے پورے نہیں کرسکتا اور نہ ہی حلال وحرام، شراب نوشی اور ساحل سمندر کی تقریبات
پر پابندی سے عمل پیرا ہوسکتا ہوں۔ یہ سن کر وہ بجھ سا گیا جیسا کہ اس کا سب کچھ کھو گیا ہو۔ میں
نے اسے حوصلہ دیا کہ فکر مت کرو دنیا ختم نہیں ہوگئی۔ یہ موقع تھا جب اس نے مجھے انگریزی ترجمہ
وتفسیر والے قرآن کریم کا ایک نسخہ عطا کیا۔ اور ساتھ ہی نصیحت کی کہ اس کتاب کو انتہائی احترام
کے ساتھ کسی اونچی جگہ پر رکھنا۔ اور جب کبھی یاد آجائے تو غسل کرنے کے بعد اس کا مطالعہ
کرتے رہنا۔ میں نے ایک ہفتے کے اندر ہی ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے قرآن کریم کھولا اور
عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں چند آیات پڑھ کر مجھے سو فیصد یقین ہوگیا کہ یہی حق ہے۔ اسلام
کی طرف میرے رجحان کو دیکھتے ہوئے شیطان نے مجھے پھر سے شرعی پابندیوں کی سختی یاد دلائی
لیکن تھوڑی سی کشمکش کے بعد میں نے فیصلہ کرلیا کہ آخر کوشش کرنے میں کیا حرج ہے ہوسکتا ہے
اللہ تعالیٰ مدد فرمائے اور میں کامیاب ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے اپنے مسلمان دوست سے فون پر
رابطہ کیا اور کلمہ طیبہ پڑھ لیا۔ میرا دوست شادی کرلینے کی وجہ سے دوسری جگہ منتقل ہو چکا تھا۔
اگلے دن مسجد میں حاضر ہوئے جہاں میں نے چند مسلمان گواہوں کے سامنے امام کے ہاتھ
اسلام قبول کیا اور میرا نام عبداللہ رکھا گیا۔ الحمدللہ اب میں مسلمان ہوں۔ میں نے پانچ وقت کی
نماز شروع کردی ہے اور تمام حرام اشیاء ترک کردی ہیں۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ امریکہ میں ہر شے
ہی حرام ہے۔ مجھے مسلمان بھائیوں نے بتانا شروع کردیا کہ تم اپنا مکان فروخت کردو اور ملازمت
بھی چھوڑ دو کہ یہ بھی حرام ہیں۔ حالانکہ یہ زیادتی بھی لگتی تھی۔ میرے دوست مجھے بتاتے رہے کہ
نماز یاد کرلو اور حرام اشیاء کھانے سے بچتے رہو اور اللہ سے بخشش اور مدد کے طلبگار رہو۔ میں اس
قدر سختی پر مطمئن نہ تھا اور میں چاہتا تھا کہ عیسائیت کی زندگی والے نفاق کو چھوڑ کر اب اپنی

مسلمان بن جاؤں۔ اس وقت میرے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ تمام مسلمان اسلام کی تعلیم پر سختی کے ساتھ کاربند ہوتے ہیں۔ لیکن مجھے تعجب کا سامنا ابھی کرنا تھا کیونکہ حقائق مجھے معلوم نہ تھے۔ اپنے خاندان کی طرف سے بھی میرے لئے مشکلات پیدا ہوئیں۔ میری بیوی شروع شروع میں تو میری اس تبدیلی پر کہ میں نے نماز پڑھنا شروع کردی ہے اور بری باتوں سے بچتا ہوں بہت خوش ہوئی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ شریعت کی پابندیوں پر پریشان ہوگئی۔ میرے والدین تو برملا اسلام اور مسلمانوں کو برا بھلا کہتے تھے۔ میری بیوی ایک کالج میں ملازمت کرتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے مسلمان طلباء اور سٹاف کے لوگوں سے پوچھا ہے وہ تو عام طور پر صرف جمعہ کی نماز میں حاضری دیتے ہیں سوائے ان چند لوگوں کے جو سختی کے ساتھ نماز کے پابند ہیں۔ وہ بھی صبح کی نماز پڑھ کر آتے ہیں پھر چھٹی کے بعد گھر جا کر بقیہ نمازیں قضا پڑھ لیتے ہیں اور کسی نے بھی تمہاری طرح کی لمبی داڑھی نہیں رکھی ہوئی۔ بلکہ وہ تو کہہ رہے تھے کہ یہ انتہا پسندی ہے۔ ان میں سے صرف دو تین نے چھوٹی چھوٹی داڑھی رکھی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ کمزور ایمان کی وجہ سے انسان میں کچھ کوتاہیاں رہ جاتی ہیں لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ میں نے پوری داڑھی رکھ لی ہے اور سر پر ٹوپی بھی اوڑھ لی ہے۔ بہرحال جیسے جیسے میں نے اسلام پر سختی سے عمل پیرا ہونے کی کوشش کی حالات بگڑتے چلے گئے۔ پھر میں نے جنوبی افریقہ کی مجلس العلماء کو خط لکھ کر اپنے رہن رکھے ہوئے مکان اور ملازمت کے بارے میں مشورہ طلب کیا۔ انہوں نے جواب میں لکھا کہ آپ صبر اور حوصلہ سے کام لیں۔ نہ تو مکان فروخت کریں اور نہ ہی ملازمت چھوڑیں بس اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرتے رہیں۔ چنانچہ میں نے ان کی ہدایات پر عمل کرنا شروع کردیا۔ اللہ کے فضل سے بہت جلد ایک مسلمان بھائی سے میری ملاقات ہوگئی جس نے مکان کے رہن کی رقم مجھے قرضہ حسنہ کے طور پر دے دی اور میں نے مکان چھڑوالیا۔ اسی طرح ملازمت کے سلسلے میں بھی میرا تبادلہ ایسی جگہ کردیا گیا جہاں صرف حلال کی کمائی تھی۔ اب میں خوش تھا کہ گھریلو زندگی کے کھچاؤ میں کمی آجائے گی اور میں یہ بتا سکوں گا کہ اسلام ازلی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد ایسی جگہ سے آتی ہے جہاں انسان کا گمان بھی نہ ہو۔ اس سے پہلے میں حج ادا کرچکا تھا اور اللہ سے دعا کرتا تھا کہ میرے خاندان کو بھی راہ ہدایت نصیب فرما

دے۔ اگرچہ وہ لوگ اسلام کی صداقت کو تسلیم کرتے تھے لیکن شریعت کی پابندی سے معذوری کا اظہار کرتے، بہرحال 11 ستمبر کے بعد حالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ میں جس علاقہ میں مقیم تھا وہ مسلم دشمنی کے لئے مشہور تھا۔ میرے سسرال والے مجھ پر اسلام ترک کرنے کے لئے مسلسل دباؤ ڈال رہے تھے۔ بالآخر میں نے مکان فروخت کر دیا اور قرضہ ادا کرنے کے بعد بیوی اور میں نے رقم بانٹ لی۔ اس نے علیحدہ چھوٹا سا گھر لے لیا اور میں نے ایک مسجد کے قریب رہائش اختیار کرلی۔ میں نے بیوی کو اس امید پر طلاق نہ دی کہ شاید وہ کسی دن اچھی مسلمان بن جائے۔ اس واقعہ کو اب دو برس ہو چکے ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میری فیملی میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں نے قرآن کریم کا کافی حصہ زبانی یاد کرلیا ہے اور احادیث بھی سیکھ لی ہیں اور عملی زندگی میں تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ میں پورے یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ جو کوئی بھی خلوص دل کے ساتھ اسلام قبول کرے اللہ تعالیٰ اس کا باطن روشن کر دیتا ہے اور ہر مشکل میں اس کی مدد فرماتا ہے۔ جب تمہیں عملی طور پر اللہ کے فضل اور اسکی رحمت کا تجربہ ہوگا تو تمہیں یقین کامل ہو جائے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اور تمہارے اعمال کو ہر وقت اپنی نگاہ میں رکھتا ہے۔ اگر کسی وقت روحانی اور قلبی کیفیات میں تعطل واقع ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کسی حرکت پر ناراض ہے تا کہ آپ توبہ کر کے دوبارہ راہ راست پر آ جائیں۔ اس طرح آپ کا ایمان مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے اور ساتھ ہی آپ اپنے اعمال اور اقوال کے بارے میں محتاط ہو جاتے ہیں۔ جب ایک دفعہ آپ اللہ تعالیٰ کی محبت کی لذت سے آشنا ہو جائیں تو پھر ایسے کاموں سے ضرور بچنے کی کوشش کریں گے تا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ خصوصی تعلق منقطع نہ ہو۔ مقام افسوس یہ ہے کہ ہم میں سے ہر ایک سے خطا ہو ہی جاتی ہے اور اللہ رحیم و کریم نے اس کے لئے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ وہ اللہ واحد ہے وہ کتنا عظیم اور مہربان ہے آپ سب پر سلام ہو۔

(عبداللہ بھائی کی خودنوشت داستان ہمارے پاس نوشہرہ ورکاں والے چوہدری محمد اشفاق صاحب کے توسط سے امریکہ سے موصول ہوئی)

ہمارے مذہبی راھنما

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواری

یہ بالکل صحیح ہے کہ قوم جیسی ہوتی ہے ویسے ہی اس کے رہبر ہوتے ہیں۔ جیسا دودھ ویسا مکھن۔ اور یہ بھی درست ہے کہ جیسے رہبر ہونگے ویسی ہی قوم بھی ہوگی۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ دانت خراب ہونے سے معدہ خراب ہوتا ہے اور معدہ خراب ہو تو دانتوں میں خرابی آجاتی ہے۔ بایں ہمہ اس چکر کا کہیں نہ کہیں سے آغاز ضرور ہوتا ہے، ہمارا غالب رجحان یہ ہے کہ قوم اور اس کے مقتداؤں میں اولیت مقتداؤں کو حاصل ہوتی ہے۔ یعنی آغاز کار رہبروں سے ہوتا ہے کیونکہ وہی اپنے طرز عمل سے افراد کو راستہ دکھاتے ہیں اور وہ اس پر چل پڑتے ہیں۔ راہنما صحیح یا غلط راستہ دکھانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن ابتدائے کار انہیں سے ہوتی ہے۔ اس لئے اچھے اور برے نتائج کی ذمہ داری بھی افراد قوم سے زیادہ ان راہبروں پر ہوتی ہے۔ راہنمائی تو کرتے ہیں مقتدا اور قوم کرتی ہے اقتداء اس کے بعد کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ جس کی ذمہ داری دونوں پر عائد ہوتی ہے۔ تقلید کرنے والوں میں کچھ لوگ تو ایسے ہوتے ہیں جو غلط راہنمائی کو سمجھنے کے باوجود تعاون کرتے ہیں اور زیادہ تر ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے حقیقت حال کو نہیں سمجھتے اور نیک نیتی سے غلط راہنمائی کا ساتھ دیئے چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پہلی قسم کے مقلد خراب نتائج کے زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں۔ راہنمائی کسی خاص شعبے تک محدود نہیں ہوتی بلکہ ہر شعبہ حیات میں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں مذہبی زندگی بھی شامل ہے۔ اور مذہبی امور میں مقتداؤں کی راہنمائی پر غور کرتے ہوئے اس کلیے کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔

راعی اور رعایا

''تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی''۔

اور اس کے بعد ہی حضور ﷺ نے راعی اور رعایا کی کچھ تفصیلات بھی بیان فرمائیں جو یہ ہیں:

ترجمہ: ''لہٰذا امام راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت (باشندگان مملکت) کے بارے میں

باز پرس ہوگی۔ مرد اپنے بال بچوں کا راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کی باز پرس ہوگی۔ عورت اپنے شوہر کے گھر کی راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کے متعلق باز پرس ہوگی۔ نوکر بھی اپنے مالک کے مال کا راعی ہے اور اس سے اسی رعیت کی باز پرس ہوگی"۔

راوی حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے شاید یہ بھی فرمایا ہے کہ:

"آدمی اپنے باپ کے مال کا بھی راعی ہے اور اس سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی"۔

اس کے بعد حضور ﷺ نے اس کلیے کو پھر زیادہ زوردار طریقے سے یوں دہرایا:

"غرض تم سب کے سب راعی ہو اور تم سب سے اپنی اپنی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی"۔

راعی کے معنی ہیں چرواہا اور رعیت کہتے ہیں چرنے والے جانور کو۔ راعی کا فرض ہے کہ وہ اپنے جانوروں کو بھٹکنے نہ دے، دوسرے کی چراگاہ میں نہ جانے دے، کسی خطرے کی طرف نہ جانے دے، بیرونی خطروں سے محفوظ رکھے، اور پیٹ بھر کر چرنے دے۔ غرض پوری نگہداشت حفاظت اور محبت کے فرائض انجام دے۔ پس جو شخص جن چیزوں کا ذمہ دار ہے وہ ان کا راعی ہے اور وہ چیزیں اس کی رعیت۔ باشندگان مملکت کا ذمہ دار امام یا امیر ہے۔ عورتوں بچوں کا ذمہ مردوں پر ہے۔ گھر کی ذمہ داری عورت کے سپرد ہے اور خادم یا فرزند (جس کے سپرد مال ہو) اس مال کا ذمہ دار ہے۔ غرض ہر راعی سے اس کی رعیت کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ "باز پرس" کا یہ مطلب نہیں کہ صرف قیامت میں ہوگی بلکہ مسئول کے معنی یہ ہیں کہ وہ ذمہ دار اور جواب دہ ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رعایا بھی مسئول ہے

اس حدیث سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ افراد کی اچھائی یا برائی کے ذمہ دار وہ رہبر ہیں جو اس کے راعی و مسئول ہیں اور جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے اس کے جواب دہ بھی وہی ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ رعیت اس کی ذمہ داری سے بالکل بری ہے۔ رعیت اگر صاحب عقل ہے تو غلط اقتدار کی ذمہ داری اس پر بھی ہوگی البتہ عقل اور نیت کے تفاوت سے ذمہ داری میں بھی تفاوت ہوگا۔

قرآنی نقطہ نگاہ اس معاملے میں یوں ہے:

''اہل کفر کہیں گے کہ اے ہمارے رب ہم نے تو اپنے سرداروں اور بڑوں کی پیروی کی بس انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا''۔

دونوں مسئول ہیں

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ گمراہ طبقہ یہی عذر پیش کرے گا کہ ہمیں گمراہ کرنے والے یہی برخود غلط راہنما ہیں اور ہماری غلطی صرف یہ ہے کہ ان کی بات مانتے چلے گئے۔ لیکن محض اتنے سے عذر سے کوئی گمراہ نتائج بھگتنے سے نہیں بچ سکے گا۔ اگر اوپر کی درج کردہ حدیث اور اس آیت قرآنی کو ملا کر دیکھیے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ راعی اور رعایا...... دوسرے لفظوں میں مقتداء اور مقلد...... دونوں ہی ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ اگر صحیح راہنمائی ہے تو دونوں ہی کو اس کا کریڈٹ ملے گا۔ اور اگر راہنمائی غلط ہے تو نتائج بھگتنے میں دونوں شریک ہونگے۔ راہنما اس لئے کہ انہوں نے غلط راستہ دکھایا اور قوم اس لئے کہ اس نے اس غلط راستے کو اختیار کیا۔

بایں ہمہ یہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ابتدائے کار راہنماؤں کی طرف سے ہوتی ہے اور قوم تعاون کر کے اسے انجام تک پہنچاتی ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک مقتداؤں کو بہر نوع تقدم و اولیت حاصل ہے۔ اور ان کی ذمہ داریاں مقلدوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہیں۔ مقلد خواہ ان کی بات مانے یا نہ مانے اور مان لینے کے بعد خاطر خواہ نتائج برآمد ہوں یا نہ ہوں۔ بہر صورت مقتداؤں کو مقلدوں سے زیادہ خوف عواقب چاہیے۔ کیونکہ عوام کی اصابت و خطا مقتداؤں کی اصابت و خطا پر منحصر ہے۔

راہنما کی ذمہ داری زیادہ ہے

کہتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے سامنے سے ایک بدمست لڑکھڑاتا ہوا گزرا۔ آپ نے آواز دی کہ: ارے او بدمست ذرا سنبھل کر چل ورنہ الٹ کر کہیں گر پڑے گا۔ اس نے کہا: ''عبدالقادر تم سنبھلے رہو میرا کیا ہے؟ اگر میں الٹا تو تنہا میں الٹوں گا، اور اگر تم الٹے تو سارا بغداد ہی الٹ جائے گا''۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو لیکن بات بڑے مزے کی ہے۔ عام افراد کی غلطی محدود ہوتی ہے مگر خواص کی غلطی محیط اثر رکھتی ہے۔ عوام میں اگر خطا و ثواب کا شعور ہو تو وہ عوام ہی کیوں رہیں اور غلطی ہی کیوں کریں؟ ان بے چاروں میں اتنا شعور نہیں ہوتا۔ ان میں شعور پیدا

کرنا مقتداؤں کا کام ہے۔ وہی راستہ سمجھاتے ہیں اور مقلد اسے اختیار کر لیتے ہیں۔

اختلاف مقاصد

اس وقت ہماری قوم کے مذہبی مقتدا مختلف طبقوں میں منقسم ہیں۔ ان میں سب سے بڑی کمزوری تو یہ ہے کہ باہم تعاون و اعتماد نہیں۔ اس عدم تعاون اور باہمی بے اعتمادی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وحدت فکر مفقود ہے۔ وحدت فکر ہمیشہ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب نصب العین (مقصد حیات) میں وحدت ہو۔ نصب العین اس واحد مقصد زندگی کو کہتے ہیں جس سے آگے اور جس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہ ہو سکے۔

اختلاف کو ذریعہ اتحاد بنانا

فرض کیجئے ایک گھر کے افراد یہ عہد کرتے ہیں کہ ہم بہر صورت اس گھر کے اندر خوشگوار فضا قائم رکھیں گے اور اسے خوش اسلوبی سے چلائیں گے تو جب وہ افراد خانہ سچے دل سے اسے مقصد بنا لیں گے تو ہر اس فرعی اختلاف کو جو اس مقصد سے ٹکرائے دبا دیں گے۔ پسند ناپسند کا اختلاف تو بہر صورت رہے گا کیونکہ یہ تقاضائے فطرت ہے۔ ترک و اختیار کا انفرادی فرق مٹایا نہیں جا سکتا لیکن اس کثرت میں ایک ایسی وحدت ضرور پیدا کی جا سکتی ہے جو نہ فقط یہ کہ اس اختلاف کو دبا دے بلکہ اس اختلاف کو مقصد کی تکمیل میں معاون بنا دے۔ اور جس طرح "گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینت چمن" اسی طرح افراد کے مختلف اذواق کو زینت مقصد کا ذریعہ بنا دے۔ یہ ایک چابک دست باغبان کا کام ہے کہ مختلف رنگ و شکل کے پھولوں کو یک جا کر کے ایک حسین گلدستہ بنا دے۔ ایسا گلدستہ جس کا ہر پھول اس گلدستے کی زینت قائم کرنے میں یکساں شریک ہو۔ جو مقتدا عوام کی تمام صلاحیتوں کو اختلاف مذاق کے باوجود ایک نصب العین کے پیچھے لگا دے وہی اس باغ کا مالی و والی ہے۔

راہنماؤں کی اقسام

ہماری قوم میں دینی راہنما تو بہت ہیں لیکن کسی ایک سلسلے میں منسلک نہیں۔ ان میں وحدت نگاہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم آہنگی بھی نہیں۔ یہ مذہبی راہنما مختلف طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں ہم ان کا الگ الگ ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے ہمارا وہ مذہبی طبقہ آتا ہے جن کو ہم حضرات "علماء" کہتے ہیں۔ ان میں کچھ

مدرسین ہیں، کچھ مفتین، کچھ واعظین و مبلغین ہیں اور کچھ ائمہ مساجد۔ پھر ان میں سے ہر ایک مسلمانوں کے کسی نہ کسی مدرسہ فکر سے وابستہ ہے۔ جو جس مکتب فکر سے وابستہ ہے اس سے ایسی عقیدت رکھتا ہے کہ اپنے فرقے کے سوا کسی اور کو قابل اعتنا نہیں سمجھتا اور بعض مواقع پر اپنے ہم خیالوں کے سوا کسی دوسرے کو مسلمان بھی نہیں تصور کرتا۔ ظاہر ہے کہ جب عصبیت اس حد تک شدت اختیار کر لے تو اتنی فراخدلی کہاں سے آسکتی ہے کہ دوسرے سے ہم آہنگی پیدا ہو؟ بظاہر سب کا نصب العین ایک ہے۔ زبان سے سب **لا الہ الا اللہ** کہہ کر وحدت نصب العین کا اقرار کرتے ہیں لیکن کسی غیر نصب العینی اختلاف کو اصل نصب العین پر قربان کرنے یا اصل کی خاطر فرع کو دبا دینے کا جذبہ نہیں رکھتے۔

علماء

اس پورے مذہبی طبقے میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ یہ صرف چند فقہی مسائل ہی کو علم سمجھتے ہیں۔ اور جو کچھ سوچتے ہیں تمام دوسرے علوم سے الگ ہو کر سوچتے ہیں۔ ان کا جمود کسی مسئلہ زندگی پر آزادانہ غور و فکر کی اجازت نہیں دیتا۔ یوں تو ہمیشہ دعویٰ یہی کیا جاتا ہے کہ "دین" ساری زندگی کے مسائل پر حاوی ہے لیکن زندگی سے تعلق رکھنے والے سارے علوم سے ناواقف ہونے کے باوجود کہے جاتے ہیں "عالم دین"۔ حیاتیات، عمرانیات، سیاسیات، طبعیات، طبقات الارض، نباتیات، فضائیات، طبیات اور بے شمار سائنسی علوم وفنون کی ابجد سے بھی یہ واقف نہیں ہوتے حالانکہ زندگی سے ان تمام علوم کا گہرا تعلق ہے۔ یہ حضرات زیادہ سے زیادہ حنفی یا غیر حنفی فقہ کے عالم ہوتے ہیں، یا حدیث کے یا تفسیر کے یا لغت وغیرہ کے۔ اور یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی طبیعیات کا عالم ہو یا فضائیات کا یا کسی اور علم کا۔ عالم دین بہر حال کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بس یہ کسی دینی جز کے عالم ہو سکتے ہیں۔ جس طرح صحت کے ماہر کو طبیب اور سائنس کے عالم کو سائنٹسٹ کہتے ہیں اسی طرح ان حضرات کو لغوی، محدث، مفسر، فقیہہ، منطقی، فلسفی، متکلم، صرفی، نحوی وغیرہ کہہ سکتے ہیں لیکن عالم دین یہ بہر حال نہیں ہو سکتے۔ دین میں صرف طہارت اور روزے نماز کے مسائل ہی نہیں آتے۔ سیاسیات، عمرانیات، تجاریات، عسکریات وغیرہ وغیرہ سارے کے سارے مسائل دین ہی کے اجزاء ہیں اور اسی طرح اجزا ہیں جس طرح روزہ نماز اور طہارت۔ اس لئے جو شخص جس فن کا ماہر اور جس ہنر کا عالم ہے اسی فن کے دائرے میں اس کی قیادت

بھی ہونی چاہیے۔ دوسرے فنوں میں.....بشرطیکہ ذوق سلیم بھی رکھتا ہو..... رائے تو دے سکتا
ہے اور اس کی رائے اگر وزنی ہو تو مانی بھی جا سکتی ہے لیکن بہر حال وہ دوسرے دائرے میں ذمہ
دار سند نہیں ہو سکتا۔ ہر فن کا ماہر ایک الگ خوشنما پھول ہے اور سارے پھولوں کو مل کر اخلاص کے
ساتھ زینت چمن کے مقصد میں تعاون کرنا چاہیے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ جس طرح صحت
بدنی کے معاملے میں ایک معالج یا طبیب کا فتویٰ قبول کرنا اولیٰ ہے اسی طرح رویت ہلال کے
بارے میں ایک ماہر فلکیات کا فتویٰ زیادہ صحیح ہے۔

مدرسین

مدرسین کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم بنیادی طور پر نا درست ہے۔
کیونکہ اسلام میں دین اور دنیا کی ثنویت موجود نہیں لہٰذا دینی مدرسوں اور دنیوی کالجوں کے الگ
الگ وجود کے معنی نہیں۔ ان دونوں کو بالکل ایک ہونا چاہیے۔

مفتیان کرام

مفتیوں کے متعلق ہماری یہ رائے ہے کہ ہر "فارغ التحصیل" کو مفتی ہونے کا حق نہیں۔ اس
کے لئے خاص شرائط کے ساتھ حکومت کی سند ہونی چاہیے۔ اور ان کا دائرہ کار بھی محدود ہونا
چاہیے۔

مبلغین وواعظین

مبلغین اور واعظین کو بھی سختی کے ساتھ اپنی حدود کا پابند کر دینا چاہیے۔ جن باتوں سے
فرقے بندی یا پارٹی بازی کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو ان کی قطعی ممانعت ہو جانی چاہیے۔ کوئی وجہ نہیں
کہ سیاسی پارٹیوں کی طرح ان مذہبی پارٹیوں کو بھی ختم نہ کر دیا جائے۔

خطبائے مساجد

ائمہ اور خطباء پر بھی اسی قسم کی پابندی ہونے چاہیے کہ وہ کوئی تفریق امت پیدا کرنے والی
بات نہ بیان کیا کریں۔ اپنے مسلک کی پابندی اور دوسروں سے رواداری ہو۔

صوفیہ

اس کے بعد مذہبی راہنماؤں کا طبقہ سامنے آتا ہے اور یہ ہیں صوفیاء۔ ان کا اثر واقتدار طبقہ
راہنما سے ہمیشہ زیادہ رہا ہے اور آج بھی زیادہ ہے لیکن اسی قدر ان کی حالت قابل رحم ہے۔ ان

میں ایک تو وہ لوگ ہیں جو کسی خانقاہ، تکیے، گدی یا آستانے پر براجمان ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو اس کے بغیر ہی راہنمائی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ دونوں طرح کے لوگوں کے متعلق آئے دن جو اخباروں میں صحیح اطلاعات آتی رہتی ہیں وہ بڑی افسوسناک ہیں۔ اعلیٰ روحانی اقدار کے یہ مراکز اب اسمگلنگ، اغواء، بھنگ، چرس اور نشوں کے اڈے بن گئے ہیں۔ یہاں کے اوقاف اور نذرانے عیش وطرب، طوائفوں، کتوں اور بٹیروں کے لئے وقف ہو گئے ہیں۔ یا تندرست مفت خوروں کے لئے۔ یہاں اصلاح یا تعلیم کے کام نہیں ہوتے یا اگر ہوتے ہیں بالکل برائے نام محض نمائشی۔ ان کی طرف بہت جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان متبرک آستانوں کے پرعقیدت مراسم نے عوام کے ذہنوں میں ''حاجت روائی'' کا ایسا عجیب تصور پیدا کر دیا ہے جو اسلامی تعلیمات سے بہت کم مناسبت رکھتا ہے اور اس کی اصلاح کے لئے موثر تدبیریں اختیار کرنا ضروری ہے۔ سادہ لوحوں کی یہی عقیدت مندی انہیں خود غرض اہل فریب کے جال میں پھنسا دیتی ہیں اور ان کی جان و مال اور آبرو پر بے تکلف ہاتھ صاف کیا جاتا ہے۔ سیاسی فریب کاریاں دیرپا نہیں ہوتیں لیکن علمی یا روحانی عقیدت کی جڑیں اس قدر مضبوط ہوتی ہیں کہ لوگ دھوکے پر دھوکا کھائے چلے جاتے ہیں۔ مگر عقیدت میں تزلزل نہیں آتا۔ اپنی آنکھوں سے بعض بدعنوانیاں دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہماری آنکھوں کی غلطی ہے۔ لٹتے اور برباد ہوتے جاتے ہیں مگر دماغ ماؤف ہوجاتا ہے کہ بربادی ہی کو وہ اپنی روحانی ترقی سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ تعلیم وتربیت کے ذریعے عوام میں صحیح اسلامی شعور پیدا کیا جائے تاکہ وہ اپنی عقل و فہم کو ان پیشواؤں کے حوالے نہ کریں۔

ضروری اطلاع

ملتان میں سید محمد امین شاہ کے بڑے بھائی سید علاؤالدین شاہ انتقال کر گئے ہیں۔

گوجرانوالہ میں محمد شفیق خاں صاحب کے بڑے بھائی محمد سرور خاں وفات پا گئے ہیں۔

گوجرانوالہ کے بزرگ بھائی حاجی محمد امین جنہیں بانی سلسلہؒ سے بیعت ہونے کا شرف حاصل تھا قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے ہیں۔

گجرات کے بھائی راجہ فضل کریم صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا ہے۔

امریکہ میں مقیم بھائی امجد نواز صدیقی صاحب کی خوشدامن کا انتقال ہو گیا ہے۔

تمام برادران سے التماس ہے کہ مرحومین کی مغفرت کے لئے دعا فرمائیں۔

خواجہ حسن نظامیؒ

ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی

یہ 1924ء کی بات ہے،

آریہ سماجی ہندو دیہات میں غریب اوران پڑھ مسلمانوں کو روپے پیسے کا لالچ دے کر انہیں مرتد بنا رہے تھے، انہی دنوں دہلی سے ایک بزرگ برما گئے اور وہاں ایک مرید عطا محمد ٹھیکیدار کے ہاں ٹھہرے۔ برما کے بت پرستوں کو جب معلوم ہوا کہ یہاں مسلمانوں کا ایک عظیم روحانی پیشوا آیا ہے، توان کے بڑے پروہت نے ان کو پیغام بھجوایا کہ میں آپ کے ساتھ مناظرہ کرنا چاہتا ہوں۔ بزرگ نے جواب دیا کہ مجھے یہ منظور ہے، لیکن اس شرط پر کہ مناظرے میں کسی جانب سے کوئی لمبی چوڑی تقریر یا سوال و جواب کا سلسلہ نہ شروع کیا جائے گا، بلکہ پروہت صاحب مجھے مندر کے اندر بت خانے میں لے جائیں گے میں وہاں جا کر بڑے بت کو حکم دونگا کہ وہ اسلام کی حقانیت کا اعلان کرے اور کلمہ پڑھے۔ بڑے بت نے کلمہ پڑھا، اور اسلام کی حقانیت کو مان لیا تو پھر پروہت سمیت وہاں موجود تمام ہندوؤں کو اسلام قبول کرنا ہوگا اور اگر بت نے میرے حکم پر کلمہ نہ پڑھا تو میں پروہت صاحب کی خواہش کے مطابق ان کا مذہب قبول کرلوں گا۔ پروہت نے یہ بات فوراً مان لی، اس خیال سے کہ بھلا بت بھی کبھی بولتے ہیں۔ اس کے بعد طے ہوگیا کہ فلاں دن اور وقت میں بزرگ مندر کے سامنے پہنچ جائیں پروہت انہیں مندر کے اندر لے جائیں گے۔

بزرگ مقررہ وقت پر مندر کے سامنے پہنچ گئے لیکن پروہت اوران کا کوئی بت پرست ساتھی وہاں موجود نہ تھا۔ مندر کا دروازہ بھی انہوں نے بند کرلیا تھا۔ آخر کئی گھنٹے انتظار کے بعد بزرگ اپنے ساتھیوں سمیت واپس اپنی قیام گاہ پر آ گئے۔

کئی روز کے بعد بزرگ برما سے رخصت ہوکر واپس دہلی جانے لگے، تو راستے میں اچانک اس پروہت سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ پروہت ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔ بولا: مہاراج! میں تو اس روز سمجھ گئے تھے کہ مسلمانوں کا یہ دینی پیشوا اتنی بڑی بات کسی روحانی قوت کے بغیر نہیں کہہ سکتا۔ اس بات سے مجھ پر اس قدر خوف طاری ہوا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ دل اندر سے کہتا تھا کہ جونہی مسلمانوں کا یہ روحانی پیشوا بت کو حکم دے گا وہ فوراً کلمہ پڑھنے لگے گا۔ مہاراج! اسی خوف

سے ہم مندر سے باہر نہیں نکلے۔

مسلمانوں کے یہ روحانی پیشوا جن کی بات سے ہندوؤں کے پروہت اس قدر لرزہ براندام ہوئے کہ مندر سے باہر بھی نہ نکل سکے.... درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے سجادہ نشین حضرت خواجہ حسن نظامیؒ تھے۔ان بزرگ کے پاس آخر کیا قوت تھی؟ ان کے پاس صرف ایمان اور یقین کی قوت تھی۔ بقول اقبالؒ

یقین پیدا کر اے غافل، یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے مغفووری

حضرت خواجہ حسن نظامیؒ 2 محرم 1296ھ کو مطابق 25 دسمبر 1878ء کو درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ دہلی میں پیدا ہوئے۔ان کے والد ماجد سید عاشق علی اگرچہ درگاہ شریف کے مقتدر پیرزادے تھے، لیکن درگاہ کے چڑھاووں سے گزر اوقات پسند نہ کرتے تھے۔اپنی روزی قرآن مجید کی جلدیں باندھ کر حاصل کرتے۔اس مقصد کے لئے پیدل دہلی جا کر مطبع مجتبائی سے قرآن مجید لاتے اور ان کی جلد بندی کرتے۔مرنے سے قبل انہوں نے اپنے بیٹے (خواجہ حسن نظامی) کو بھی یہی وصیت کی کہ بیٹا! ہمیشہ محنت کر کے رزق حلال سے اپنا پیٹ بھرنا۔اگر لوگ تمہیں محنت مزدوری کرنے والے جلد ساز کا بیٹا کہیں تو برا مت ماننا، البتہ درگاہ شریف کی آمدنی سے مفت میں پیٹ بھرنے والا پیرزادہ کہیں، تو اسے بری بات سمجھنا کیونکہ ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ نہیں تھا۔

خواجہ صاحب کے والد ماجد کا انتقال ہوا، تو اس وقت ان کی عمر بارہ سال کی تھی۔ایک سال قبل یعنی گیارہ سال کی عمر مین وہ اپنے والد ماجد کے ساتھ تونسہ شریف گئے تھے اور انہوں نے والد کے کہنے پر حضرت شاہ الہ بخش تونسویؒ کی بیعت کی تھی۔پھر چودہ سال کی عمر میں وہ بڑے بھائی کے ساتھ چاچڑاں (بہاولپور) میں گئے تو انہوں نے بھائی کے کہنے پر حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی بیعت کی۔اس سے قبل وہ دہلی میں حضرت مولانا محمد اسماعیل کاندھلویؒ (تبلیغی جماعت کے بانی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے والد) سے ابتدائی دینی کتابیں یعنی جلالین اور مشکوۃ تک اور مولانا عبدالعلی محدث، مولانا وصیت علی، حکیم رضی الحسن، مولانا حکیم الہ دین اور مولانا محمد یحییٰ سے سنن ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کتابیں پڑھ چکے تھے۔اس کے بعد وہ مزید تعلیم کے لئے گنگوہ (سہارنپور) میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دو سال مدرسہ

رشید یہ رہ کر حدیث، تفسیر اور فقہ کی تعلیم کی تکمیل کی۔ یہیں انہوں نے مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ سے دورہ حدیث بھی کیا۔

علم ظاہری سے فراغت کے بعد انہوں نے حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ کی بیعت کی۔ اس کا حال خود خواجہ صاحب نے یوں لکھا ہے کہ حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ سے مرید ہونے کی ترغیب میرے دل نے دی۔ میں حضرت خواجہ الہ بخش تونسویؒ اور حضرت خواجہ غلام فرید صاحبؒ کو کامل اور مکمل پیر تصور کرتا تھا، لیکن ان کے بقید حیات نہ ہونے کے سبب ایک زندہ ہادی کی ضرورت محسوس کرتا تھا، اس واسطے میں اکثر استخارے کیا کرتا تھا کہ کسی رہنما کا پتہ ملے۔

تعلیم کی تکمیل کے بعد خواجہ صاحب نے درگاہوں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا، اور اس کا آغاز یوں کیا کہ اس زمانے میں عرسوں کے موقع پر زنان بازاری کا جو ناچ گانا ہوتا تھا، اس کے خلاف مہم چلائی شروع میں اس اصلاحی تحریک کی سخت مخالفت ہوئی لیکن خواجہ صاحب پامردی و استقامت کے ساتھ اس پر ڈٹے رہے اور بالآخر طویل جدوجہد کے بعد ہندوستان بھر کی درگاہوں سے اس قبیح رسم کو ختم کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے حلقہ نظام المشائخ کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور ملا واحدی کی رفاقت میں ایک ماہوار رسالہ نظام المشائخ بھی جاری کیا۔

حضرت علامہ اقبالؒ بھی حلقہ نظام المشائخ کے ممبر تھے اور ان کے خواجہ صاحب کے ساتھ بہت زیادہ مراسم تھے۔ 1905ء میں جب وہ تعلیم کے سلسلے میں یورپ جانے لگے تو راستے میں خواجہ صاحب کے ہاں دہلی میں رکے۔ خواجہ صاحب انہیں درگاہ شریف حضرت نظام الدین اولیاؒ میں لے گئے۔ وہیں بیٹھ کر علامہ نے اپنی وہ لازوال نظم لکھی جو "التجائے مسافر" کے عنوان سے "بانگ درا" میں موجود ہے۔ اس وقت کہی ہوئی اس نظم میں علامہ مرحوم کا یہ شعر بھی شامل تھا۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا ہے جن کی بدولت یہ آستاں مجھ کو

1911ء میں ایک ملاقات میں علامہ اقبالؒ نے خواجہ صاحبؒ سے کہا کہ مسلمانوں کی باہمی نااتفاقی مجھے اکثر بے چین رکھتی ہے۔ اگر آپ خاص طور پر مصر، شام، فلسطین اور حجاز وغیرہ اسلامی ممالک میں جا کر وہاں مسلم اکابر سے ملیں اور ان سے مسلمانوں کے اتحاد کے سلسلے میں

گفتگو کریں تو یہ بات بہت مفید ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ اتحاد کے بغیر مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ ممکن نہیں۔ علامہ سے اس ملاقات کے بعد خواجہ صاحب نے اسلامی ملکوں کے دورے کا پروگرام بنایا اور مصر، عراق، شام، فلسطین اور حجاز وغیرہ ممالک میں جا کر تمام مسلم اکابر سے ملاقاتیں کیں اور ان سے تفصیلی تبادلہ خیالات کیا۔ اس سفر کے دوران وہ روضہ رسول مقبول ﷺ بھی حاضر ہوئے، وہاں انہوں نے رو رو کر جو طویل دعا مانگی، آپ اس کا ایک اقتباس دیکھ لیجئے۔ عرض کرتے ہیں:

"یارسول اللہ ﷺ آپ کا ناکارہ ناخلف حسن نظامی حال دل عرض کرنا چاہتا ہے۔ میرا ایمان ہے کہ حق وقیوم کی عنایت سے حضور ﷺ جامہ حیات میں موجود ہیں، دیکھ سکتے ہیں اور وہ کر سکتے ہیں، جو دوسرا نہیں کرسکتا..... اسلام آپ کا پیارا اسلام، آپ کے اللہ کا مقبول اسلام۔ آپ کے جدامجد سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا پسندیدہ اسلام نرغے میں ہے، امراء نے گھیر لیا ہے اکیلا رہ گیا ہے کوئی یار وناصر نظر نہیں آتا۔

عرب، دریائے اسلام کا سرچشمہ روز بروز پست ہو رہا ہے۔ دشمن اسے زیرنگیں کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس عرب کو زیرنگیں کرنا چاہتے ہیں، جس نے ساری دنیا کو زیرنگیں کرلیا تھا۔

عرب کی محافظ سیف عثمانی کو بھی زنگ لگ گیا ہے۔ میں پاک مدینے میں غیروں کے سکے چلتے دیکھتا ہوں اور غیروں کی تجارت کا فروغ پاتا ہوں، تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سرکار! سکہ حکمرانی کی نشانی ہے کیا غیروں نے یہاں کی حکمرانی میں دخل حاصل کرلیا ہے؟

یارسول اللہ ﷺ! حکومت ہمارے ہاتھوں سے نکلی چلی جارہی ہے۔ چین میں ہم محکوم، جاوا میں ہم محکوم، تاتار و بخارا میں، ہم محکوم، ہندوستان میں ہم محکوم، ایران میں کشتی ڈگمگا رہی ہے، مراکو کا گلا کٹ چکا ہے، مصر کو ابھی دیکھ کر آیا ہوں۔ مسلمان سر بازار شراب پیتے ہیں اور دین کی کسی بات میں جی نہیں لگاتے۔ یارسول اللہ ﷺ کاسہ لبریز ہوگیا۔ بے کس و بے بس امت کی دستگیری فرمائیے۔ (سفرنامہ مصروشام وحجاز)

اس اقتباس میں اس عہد کے عالم اسلام کی ایک جھلک کے ساتھ ہمیں حضرت خواجہ صاحبؒ کا ملی شعور اور ان کا اندرونی کرب بھی صاف نظر آتا ہے، جو حضرت علامہ اقبالؒ کی طرح انہیں بھی دن رات بے چین رکھتا تھا۔

بچپن میں خواجہ صاحب جب مولانا محمد اسماعیل کاندھلویؒ سے پڑھتے تھے، تو اس وقت

مدرسے میں ان کے ساتھ کئی مغل شہزادے بھی تعلیم پاتے تھے۔ 1857ء کے غدر کو ابھی زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ خواجہ صاحب ان شہزادوں کی زبانی غدر کے حالات سنتے تو ان کا جی انگریزوں کے مظالم پر بہت کڑھتا تھا۔ ان شہزادے اور شہزادیوں کے دردناک حالات انہوں نے اپنی کتاب "بیگمات کے آنسو" میں جمع کیے۔ یہ کتاب شائع ہوئی، تو ایوان اقتدار میں زلزلہ آ گیا۔ انگریز ڈپٹی کمشنر بار بار انہیں بلا کر دھمکاتا تھا اور کہتا تھا کہ آئندہ ایسی کتاب شائع کرو گے تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ لیکن خواجہ صاحب پر ان دھمکیوں کا اثر یہ ہوا کہ انہوں نے غدر دہلی کے حالات پر مبنی دو تین نہیں اکٹھی پندرہ سولہ کتابیں شائع کیں۔ ان کتابوں سے جہاں لوگوں کو غدر کے بارے میں قیمتی معلومات حاصل ہوئیں، وہاں لوگوں کے دلوں میں انگریز کے خلاف سخت نفرت بھی پیدا ہوئی۔ خواجہ صاحب کے دلکش انداز تحریر کے باعث یہ کتابیں بار بار چھپتی تھیں اور لوگ انہیں انتہائی دلچسپی کے ساتھ پڑھتے تھے۔ خواجہ صاحب کے انداز تحریر کے بارے میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" میں لکھا ہے کہ علامہ اقبال فرماتے تھے کہ اگر میں خواجہ حسن نظامی جیسی نثر لکھنے پر قادر ہوتا تو کبھی شاعری کو اظہار خیال کا ذریعہ نہ بناتا۔ حضرت علامہ اقبال کی طرف سے خواجہ صاحب کی نثر نگاری کو یہ بہت بڑا خراج تحسین ہے۔ خواجہ حسن نظامی کو قدرت کی طرف سے جو بھی ادبی صلاحیت عطا ہوئی تھی، انہوں نے وہ تمام تر دین اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لئے صرف کی۔

یوں تو خواجہ صاحب کی تمام عمر خدمت اسلام میں گزری لیکن ان کا ایک بڑا کارنامہ تحریک شدھی کو ناکام بنانا تھا۔ شدھی تحریک کا کرتا دھرتا سوامی شردھانند ایک آریہ لیڈر تھا، جو کانگریس میں شامل ہونے کے بعد جیل گیا اور وہاں سے یہ خیال لے کر پلٹا کہ مسلمان ہمیشہ الگ حقوق کا سوال اٹھاتے ہیں، بہتر ہے انہیں ہندو بنا لیا جائے، تاکہ الگ حقوق کی بحث ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے اس نے طوفان کی سی تیزی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا اور ان دیہات میں جہاں ان پڑھ اور غریب مسلمانوں کی کثرت تھی اس نے روپے پیسے کا لالچ دے کر انہیں مرتد بنانا شروع کیا۔ اس کام کو وہ شدھی کا نام دیتا تھا یعنی پاک بنانے کا کام۔ لیکن مسلمانوں کے نزدیک دین اسلام سے پھر جانے کو ارتداد کہا جاتا ہے۔ خواجہ صاحب اس موقع پر انسداد ارتداد کے لئے پوری قوت کے ساتھ میدان میں اترے اور مسلمانوں میں اسلام کی سمجھ بوجھ

کرنے کے لئے ہر گاؤں اور قصبہ میں گئے اور اپنی پر اثر تقریروں کے ذریعے ان میں اسلامی بیداری پیدا کی۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے کروڑوں کی تعداد میں ہینڈ بل، پوسٹر اور پمفلٹ شائع کر کے متاثرہ علاقوں میں مفت تقسیم کئے۔ ملا واحدی ''سوانح عمری حضرت خواجہ حسن نظامیؒ'' میں لکھتے ہیں: خواجہ صاحب نے انسداد ارتداد کا کام ایسی مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا کہ شدھی تحریک میں سوامی شردھانند کسی ایک جگہ بھی کامیابی حاصل نہ کر سکا''۔

خود خواجہ صاحب تحریک انسداد ارتداد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''آریہ سماجیوں نے جب میرے بزرگوں کے مسلمان کئے ہوئے راجپوتوں کو مرتد کرنے کا کام شروع کیا اور لاکھوں آدمیوں کو مرتد کر دیا، تو اس وقت میں نے چھ برس کی لگاتار کوشش سے چھ لاکھ راجپوتوں کو مرتد ہونے سے بچا لیا اور ان کے لئے ہندی زبان میں قرآن مجید بھی شائع کیا۔ اس کے علاوہ ایک لاکھ آدمیوں کو دائرہ اسلام میں بھی داخل کیا۔ (حاشیہ نظامی بنسری ص154)

خواجہ صاحبؒ سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے وہ جلیل القدر بزرگ تھے جنہوں نے اپنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال خلفاء کو متحدہ ہندوستان کے اکثر مقامات کے علاوہ ایران، ترکستان، افغانستان، سوئٹزرلینڈ، سان فرانسسکو، روم، فرانس اور امریکہ میں بھی بھیجا، ان ممالک میں جا کر ان کے خلفاء نے اسلام کی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے سچ کہا تھا۔

حسن نظامیؒ ہیں نیک بے شک، مگر نہ کہیے کہ نیک ہی ہیں
لطائف قلب کی نظر سے بھی اس زمانے میں ایک ہی ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں ان اللہ والوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیقات ارزائی فرمائے تاکہ ہم بھی اپنے ملک و دین کے لئے مفید خدمات انجام دے سکیں۔ آمین!

(بشکریہ نوائے وقت)

دنیا اقبال کی نظر میں

عبدالرشید ساقی

علامہ اقبال ایک عظیم مفکر اور عالم اسلام کے مایہ ناز صوفی شاعر ہوئے ہیں آپ کا سارے کا سارا کلام اسلام کے رموز و حقائق کو آشکار کرنے پر مشتمل ہے میری نظر میں علامہ اقبال بحر ترجمان قرآن ہیں آپ کی ساری شاعری میں قرآن حکیم کا مقصد نزول صاف آئینے کی مانند نظر آتا ہے۔ قرآن کریم میں کئی بار رب العزت نے دنیا کو محض لہو ولعب فرمایا ہے۔ علامہ بھی فرماتے ہیں:

یہ دیر کہن کیا ہے؟ انبار خس و خاشاک
مشکل ہے گزر اس میں بے نالہ آتشناک

اقبال نے بھی دنیا کو انبار خس و خاشاک یعنی کوڑا کرکٹ سے تشبیہ دی ہے کیونکہ دنیا کوڑا کرکٹ کے ڈھیر کی طرح بے قیمت اور ہیچ مایہ ہے فانی اور غیر محکم ہے۔ جس طرح کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر سے اپنے آپ کو پاک صاف رکھ کر گزرنا دشوار ہوتا ہے اسی طرح دنیاوی علائق میں پھنس کر انسان کو زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کی صورت یہ ہے کہ آدمی خس وخاشاک دنیوی سے اپنا دامن بچائے اور اس کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ انسان عشق الٰہی اختیار کرے۔ جس طرح آگ خس وخاشاک کے ڈھیر کو جلا کر فنا کر دیتی ہے اسی طرح عشق الٰہی کی آگ دنیاوی علائق کے خس وخاشاک کے ڈھیر کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے جب انسان اللہ کی ذات سے تعلق استوار کر لیتا ہے تو وہ زندہ ہو جاتا ہے اور جس انسان کا تعلق اللہ سے کٹ جاتا ہے وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میرا ذکر کرنے والے زندہ اور ذکر نہ کرنے والے مردہ ہیں۔ انسان کی حقیقی زندگی کا راز اللہ کی ذات کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑ لینے میں مضمر ہے یہ ایک راز ہے جو اس کو پالیتا ہے وہی ابدی زندگی پا لیتا ہے۔ میاں محمد صاحبؒ فرماتے ہیں

کرسی عشق جد اپنا تینوں چھٹسن سب اشنایاں
مایے بجن یاد نہ رہسن حرص نہ بھینا بھائیاں

عشق الٰہی انسانی زندگی کی معراج ہے اس عشق میں انسانی عظمت کا راز ہے۔ عشق الٰہی ہی انسان کی ابدی زندگی کا ساز ہے اسی ساز کی غیر فانی آواز ہے

یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتان وہم و گماں لا الہ الا اللہ

علامہ اقبال فرماتے ہیں:

اک شرع مسلمانی، ایک جذب مسلمانی
ہے جذب مسلمانی سر فلک والافلاک

دین اسلام دو چیزوں کا مجموعہ ہے ایک کا نام شریعت ہے اور دوسری شریعت کا باطنی پہلو ہے جسے طریقت کہتے ہیں درحقیقت دوئی نہیں ہے محض سمجھانے کے لئے دو لفظ وضع کئے گئے ہیں۔ سالک کو پہلے ارکان اسلام کی پابندی کرنی سکھائی جاتی ہے مثلاً اس کو کہا جاتا ہے نماز پڑھو، روزہ رکھو، مال ہو تو زکوٰۃ دو، اگر اللہ تعالیٰ نے استطاعت دے رکھی ہے تو حج بیت اللہ ادا کرو، جب سالک ان عبادات کا عامل ہو جاتا ہے تو پھر اس کو یہ نکتہ سکھایا جاتا ہے وقت مقررہ پر جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا "شرع مسلمانی" ہے۔ لیکن جب نماز پڑھو تو اپنی تمام تر توجہ اللہ کی طرف مبذول کردو۔ نماز میں غیر اللہ کا تصور نہ آنے پائے جب تم اللہ کے بندے ہوگئے تو پھر غیر اللہ سے قطع تعلق کرلو غیر اللہ کی اطاعت مت کرو جب تمہارا معبود اللہ ہے تو اسے مطلوب بھی بناؤ یعنی اس سے محبت بھی کرو۔ یہ ہے "جذب مسلمانی" یا شریعت کا باطن۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں: صرف ارکان اسلام کی پابندی کر کے یہ مت سمجھ لو کہ شریعت کا تقاضا پورا ہو گیا پابندی ارکان اسلام سے یعنی "شرع مسلمانی" سے بالاتر بھی ایک درجہ ہے جسے "جذب مسلمانی" کہتے ہیں علامہ فرماتے ہیں:

جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پہ اسرار شہنشاہی

مقام عشق و محبت وہ درجہ ہے جب مسلمان اس کو حاصل کر لیتا ہے تو ساری کائنات کے اسرار و حقائق اس پر کھل جاتے ہیں عشق الٰہی کے بغیر نہ تو عمل صالح ممکن ہے اور نہ دل میں یقین کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام میں مورخ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ محمود غزنوی نے کسی ولی اللہ کی خدمت میں سونے کی اشرفیاں تحفہ میں بھجوائیں تو انہوں نے اشرفیاں یہ کہتے ہوئے واپس کردیں کہ محمود غزنوی خدا کب سے بن گیا ہے، کیا جو خدا اس کو روزی دیتا ہے مجھے بھول گیا ہے نہیں ایسا نہیں وہی مجھے بھی روزی دیتا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ محمود کو اس کا لکھا دیتا ہے اور مجھے میرا لکھا دیتا ہے اور میں خدا کی اس دین پر پورا خوش ہوں۔

جس کی "جذب مسلمانی" بیدار ہو جاتی ہے اس میں بے نیازی کا رنگ جھلکنے لگتا ہے جو مالدار شخص حساب کتاب کر کے مال کا ڈھائی پرسنٹ اللہ کی راہ میں دے دیتا ہے "شرع مسلمانی"

میں شمار ہوتا ہے لیکن جو انسان اللہ کی راہ میں گھر کا آدھا سامان یا گھر کا سارے کا سارا سامان راہ خدا میں دے دیتا ہے وہ "جذب مسلمانی" کے مقام پر فائز ہوتا ہے کوئی جانور راہ خدا میں قربان کرنا "شرع مسلمانی" ہے لیکن حضرت اسماعیلؑ کی گردن پر چھری چلا دینا "جذب مسلمانی" کے زمرہ میں آتا ہے۔

رمزیں ہیں محبت کی گستاخی و بیباکی
ہر شوق نہیں گستاخ ہر جذب نہیں بیباک

علامہ اقبال فرماتے ہیں اللہ کی محبت کا ثمرہ یہ ہے کہ مسلمان میں گستاخی و بیباکی کی شان پیدا ہو جاتی ہے یعنی وہ کسی دنیاوی طاقت یا مادی حکومت یا کسی بادشاہ سے نہیں ڈرتا۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ شان، ہر محبت سے پیدا نہیں ہوسکتی ہر شوق، بیباکی کی دولت عطا نہیں کرسکتا۔ یہ دولت اک نعمت گراں مایہ ہے یہ صرف اور صرف اللہ کی محبت سے حاصل ہوسکتی ہے۔

عشق ہے اک نعمت گراں مایہ — بزدلوں کو عطا نہیں ہوتی
من کی دولت جسے میسر ہو — اس کی ہستی فنا نہیں ہوتی

میدان کربلا میں ننھا سا حسینی لشکر جو کہ بہتر نفوس پر مشتمل تھا صرف عشق الٰہی کے جذبہ کی بدولت چالیس ہزار یزیدی لشکر جرار سے ٹکرا گیا اور بہادری، دلیری، شجاعت، صبر اور حریت کی ایک مثال قائم کردی جو کہ عظمت اسلام کو ہر دور میں درخشندہ و تابندہ رکھے گی اور حرمت اسلام کا سر ہمیشہ سربلند رہے گا حق وصداقت پر ڈٹ جانے کی روایت قیامت تک ہر دور میں سربلند رہے گی۔ حق و کفر کے تصادم کی جنگ کربلا میں ختم نہیں ہوئی بلکہ ہر دور اور ہر سطح پر حسینی اور یزیدی قوتیں پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے مقابلے میں برسر پیکار ہیں۔ آج بھی عالمی سطح سے لے کر انفرادی سطح پر حسینی اور یزیدی قوتیں ایک دوسرے کے مقابلے میں برسر پیکار ہیں حق اور باطل کا معرکہ ہر وقت جاری وساری رہتا ہے۔ بدی کی قوتوں نے کئی مرتبہ حق پر غالب آنے کے دعوے کئے لیکن بالآخر وہ باطل ثابت ہوئے اور کفر کو پسپا ہونا پڑا کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت اور قانون فطرت ہے کہ آخری فتح اور کامیابی ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔

خون حسینؓ کی قسم لاکھوں یزید ہیں یہاں
ہے یہی ارض کربلا کلمہ حق اٹھا کر دیکھ

ابتدائے اسلام کے دور کو دیکھیں جب نبی مکرم ﷺ نے کلمہ حق کی صدا بلند فرمائی تو اسی وقت سے مخالفت شروع ہوگئی یہ مخالفت نبی مکرم ﷺ کی ذات گرامی کی نہ تھی بلکہ حق وصداقت کی

مخالفت تھی کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی ذات تو تمام اہل عرب کے لئے قابل صد احترام و محبت تھی وہ آپ کو صادق اور امین کے القاب سے نوازتے تھے، شفقت اور محبت کرتے تھے۔ ابولہب جو کہ ایذاء رسانی میں سب سے پیش پیش تھا اس نے آپ کی ولادت کی خبر سن کر لونڈی آزاد کی تھی لیکن جب آپ نے اعلان نبوت فرمایا تو انہوں نے مخالفت شروع کر دی کیونکہ ان کو یہ گوارا نہ ہوا کہ ان کی شان میں کمی آئے یا ان کی خاندانی بے مایہ روایت پر ضرب پڑے کیونکہ اسلام کی آمد سے ان کی جھوٹی شہرت کے ختم ہونے کا احتمال تھا اور یہ ان کو گوارا نہ ہوا۔ لیکن آپ کے کردار کی عظمت نے سرمایہ داری اور جاگیرداری کے تمام جھوٹے دعوے باطل ثابت کر دیئے اور اصل خدا کے مقابلے میں خود ساختہ پتھر، لکڑ اور نفسانی خواہشوں کے بت پاش پاش ہو گئے اور اسلام کا نور سارے عالم میں ہر سو پھیل گیا۔ اگر آج بھی ہم اپنے اپنے کردار کا تعین اسلامی ضابطوں کے مطابق کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی و کامرانی سے نوازے نہ جائیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ملاں کی شریعت میں فقط مستی گفتار — صوفی کی طریقت میں صرف مستی احوال
وہ مرد قلندر نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار
فارغ نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا — یا اپنا گریباں چاک، یا دامن یزداں چاک

علامہ فرماتے ہیں اے مسلمان! دنیاوی محبت فانی ہے اس کا جلوہ صرف اِسی دنیا میں نظر آتا ہے ہر محبت موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے لیکن اللہ کی محبت باقی ہے اس کو کبھی فنا نہیں ہے۔ خدا کا عاشق مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو گا اس وقت بھی اس میں شان عشق موجود ہو گی اور وہ محشر میں بھی جذبہ عشق سے فارغ نہیں ہو سکتا۔ مومن کی شدید ترین محبت اپنے مالک و خالق سے ہونی چاہیے لیکن آج کا انسان مادی محبت میں گرفتار ہو کر اپنے خالق کو بالکل فراموش کر بیٹھا ہے۔ اسی لئے گمراہی اور بدی کی گہرائیوں میں فنا ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو قرآن مجید میں متاع قلیل کے نام سے پکارا ہے اور واضح فرمایا ہے کہ "ہم نے انسان کو روزی کمانے کے لئے پیدا نہیں فرمایا روزی تمہیں ہم دیں گے"، لیکن ہم پر روزی کمانے کا خبط سوار ہو چکا ہے انسان اپنی اصلیت کو بھول گیا ہے یعنی اپنی یادداشت گنوا بیٹھا ہے۔ علامہ فرماتے ہیں:

تیرا جوہر ہے نوری پاک ہے تو — فروغ دیدہ افلاک ہے تو
تیرے صید زبوں فرشتہ و حور — کہ شاہین، شہ لولاک ہے تو

خطاب بہ جاوید

(خطاب بہ جاوید کے آخری باب کے فارسی متن کا اردو ترجمہ)

مہر جاوید اقبال لاہور

یہ تمام شاعری بے سود ہے کیونکہ جو کچھ دل کی پنہائیوں میں پوشیدہ ہے وہ ہرگز آشکار نہیں ہوسکتا۔ گوکہ میں نے ہزاروں نکات کو واضح طور پر بیان کیا ہے، تاہم ایک نکتہ ایسا ہے کہ جس کا اظہار میں نے اپنے کلام میں نہیں کیا۔ اگر میں اس نکتہ کو بیان کروں گا تو الفاظ اور آواز کا اشتراک اس کے ابلاغ کو مزید مشکل بنا دے گا۔ اے نوجواں! تو اس کے سوز کو میری نگاہوں یا پھر میری صبح کی آہوں سے حاصل کر۔

اے جاوید! تیری ماں نے تجھے پہلا سبق دیا ہے اور تیرے وجود کا غنچہ اسی کی باد نسیم سے شگفتہ ہوا ہے۔ اسی کے باعث تجھ میں یہ رنگ و بو پیدا ہوئی ہے۔ اے ہمارے قیمتی سرمایہ! تیری سب قدر و قیمت تیری ماں کی موہون منت ہے۔ تو نے اس سے ایک دائمی دولت حاصل کی ہے اور اس کے لب سے لا الہ کے الفاظ سیکھے ہیں۔ اے بیٹے! اب تو ذوق قلب و نگاہ مجھ سے حاصل کر اور الہ کے سوز میں جلنا مجھ سے سیکھ۔ تو لا الہ کہتا ہے تو دل و جان سے کہہ تا کہ تیرے جسم سے روح کی خوشبو آئے۔ چاند اور سورج لا الہ کی آگ سے ہی گردش میں ہیں اور میں یہی سوز پہاڑ اور گھاس کے تنکے میں بھی دیکھتا ہوں۔ لا الہ کے یہ دو حروف محض زبان سے ادا کرنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ یہ الفاظ تو ایک بے باک تلوار کی مانند ہیں (کہ جو حق و باطل میں تمیز کرتی ہے)۔ لا الہ کے سوز کے ساتھ جینا ایک پرشکوہ انداز زیست ہے۔ لا الہ ایک ضرب ہے، معمولی نہیں بلکہ ایک بھرپور اور کاری ضرب ہے۔

مومن لوگوں کے سامنے اپنا کمر بند نہیں باندھتا (یعنی اقوام غیر کے سامنے دست احتیاج نہیں پھیلاتا)۔ مومن اور غداری، فقر اور نفاق باہم متضاد چیزیں ہیں (یعنی مومن غدار نہیں ہو سکتا اور نہ وہ خدا کے سوا کسی کے سامنے جھکتا ہے)۔ آج مسلمان نے دو کوڑیوں کے عوض اپنا دین ایمان بیچ دیئے ہیں، اور نہ صرف اسباب خانہ بلکہ گھر کو بھی خود ہی جلا دیا ہے۔ ماضی میں مسلمان کی نماز کے اندر لا الہ کی روح تھی مگر اب نہیں ہے۔ پہلے اس کے عجز و انکسار میں ہی اس کا افتخار تھا مگر اب اس میں یہ خوبیاں نہیں رہیں۔ پہلے اس کی نماز و روزہ میں ایمان کا نور تھا اور اسی نور سے اس کی کائنات روشن تھی مگر اب یہ نور مفقود ہو گیا ہے۔ وہ مومن کی جس کا تمام تر تکیہ ذات باری

تعالی پر تھا اور جس کے لئے دولت کی محبت اور موت کا خوف فتنے کی حیثیت رکھتے تھے، آج اس سے عشق حقیقی کی مستی اور ذوق و سرور چھن چکا ہے۔ اب اس کا دین کتاب میں محفوظ ہے اور یہ خود قبر کے اندر ہے۔ اس جدید دور میں مومن دنیاوی معاملات و مسائل سے الجھ کر رہ گیا ہے۔ اب اس نے قرآنی تعلیمات سے صرف نظر کر کے دینی امور کو دو جھوٹے پیغمبروں سے سیکھا ہے۔ ایک پیغمبر ایران سے ہے (یعنی مرزا حسین علی، بہاء اللہ) اور دوسرا سر زمین ہند سے ہے (یعنی مرزا غلام احمد قادیانی)۔ ایران والا حج سے منکر ہے جبکہ ہندوستان والا جہاد سے لاتعلق۔ اور جب جہاد اور حج کو شعائر اسلامی سے خارج کر دیا گیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نماز اور روزہ کی معنویت بھی زائل ہو گئی۔ پھر نماز و روزہ بے جان ہو گئے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ اخذ ہوا کہ انفرادی سطح پر مرد مسلمان انتشار کا شکار ہوا اور اجتماعی سطح پر ملت اسلامیہ بے نظام ہو گئی۔ اب مسلمانوں کے سینے سوز ایمانی سے خالی ہو چکے ہیں، سو ان سے بہتری کی توقع کیونکر رکھی جا سکتی ہے۔ افسوس کہ مسلمان کے ہاتھ سے اس کا جوہر خودی جاتا رہا۔ اے خضرؑ! اپنے ہاتھ بڑھا کر سہارا دیجئے کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔

مرد مومن کے سجدوں کی تاثیر سے تو زمین پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ اور اس کی خواہش کے مطابق سورج اور چاند گردش کرنے لگتے ہیں۔ اگر پتھر سجدہ مومن کا نقش اپنے اندر جذب کر لے تو وہ اس کے سوز سے پارہ پارہ ہو کر دھوئیں کی طرح ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ آج کے دور میں مسلمان کا قبلہ اقوام مغرب ہیں۔ وہ ان کے سامنے سر بسجود ہے اور ضعف ایمان کے باعث وہ ذلیل و رسوا ہو گیا ہے۔ اس کی وہ ایمانی عظمت و شوکت کیا ہوئی کہ جو اسے ماضی میں حاصل تھی۔ یہ ذلت و رسوائی اس کی اپنی کوتاہیوں کے سبب اس کا مقدر بنی ہے یا کہ اس کا باعث ہماری کوئی تقصیر ہے؟ ہر کوئی اپنے راستہ پر منزل مقصود کی طرح گامزن ہے جبکہ ہماری اونٹنی (یعنی ہماری امت) بے لگام ہے اور ادھر ادھر فضول بھاگ دوڑ کر رہی ہے یہ امر سخت تعجب خیز ہے کہ صاحب قرآن یعنی مرد مومن، قوت عمل اور ذوق طلب سے بے بہرہ ہے۔ ہائے افسوس!

اے مخاطب! اگر خدا تجھے صاحب نظر بنا دے تو اس زمانہ کو دیکھ جو تیرے مقابل ہے۔ دیکھ! کہ عقلیں کس قدر بے باک ہیں اور دل بے سوز ہیں۔ آنکھیں بے شرم ہیں اور ظاہر پرست بن گئی ہیں۔ علم و فن، دین و سیاست اور عقل و دل یہ سب اس مادی کائنات کے نظام میں جڑواں جڑواں ہیں۔ ماضی میں مسلمان کے لئے جغرافیائی حد بندی کچھ معنی نہ رکھتی تھی وہ ساری دنیا کو اپنا وطن

سمجھتا تھا مگر آج کے مسلمان نے خود کو ایشیا کی سرزمین تک محدود کر لیا ہے۔ اور اقوام مغرب کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگا ہے۔ اب وہ اپنی حیثیت سے نا آشنا ہو کر غیروں کی تہذیب و ثقافت کا پرستار بن گیا ہے اب اس کا دل ذوق جستجو سے تہی ہے اور اسے نت نئے تجربات سے کچھ دلچسپی نہیں رہی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کے علم و فن کی کوئی قدر نہیں۔ اس کی جمع پونجی کو کوئی دو جَو کے عوض بھی نہیں لے گا۔ اس جہاں میں اب مسلمان کی زندگی جامد و ساکت ہو گئی ہے اور اس میں سیر و سیاحت کا ذوق باقی نہیں رہا۔ آج ایشیائی مسلمان ملوکیت اور ملائیت کے طلسم میں اسیر ہیں اسی وجہ سے ان کی عقل اور ذہن بالکل بیکار ہو گئے ہیں۔ اب ان کی عقل و دین و دانش اور ننگ و ناموس انگریز لارڈز کے تسموں سے بندھی ہوئی ہے۔ (یعنی جسمانی و ذہنی اعتبار سے انگریزوں کے محکوم ہیں) میں نے ان (انگریزوں) کی دنیائے فکر پر چرکے لگائے ہیں اور ان کی نام نہاد تہذیب و تمدن کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے لیکن یہ یونہی ممکن نہیں ہوا بلکہ میں نے پہلے اپنے دل و سینے کے اندر (اپنی قوم کے غم میں) خون کیا اور پھر کرنے کے قابل ہوا کہ اقوام مغرب کی دنیائے فکر میں ہنگامہ برپا کر دیا۔

میں نے اپنے عہد (کے افراد) کی فطرت کے مطابق دو حرف کہے ہیں۔ (یعنی دو کتابیں تصنیف کی ہیں) گویا میں نے دو سمندروں کو دو کوزوں میں بند کر دیا ہے۔ ایک تو پیچیدہ بات ہے (مراد اپنی فلسفیانہ تصنیف یعنی تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) اور دوسری کاٹ دار لہجے کی بات (مراد اپنی طنزیہ شاعری) یہ اس لئے کہ میں افراد کے عقل و دل کو شکار کر سکوں۔ کچھ باتیں (شاعری) انگریزوں کے سے انداز میں یعنی علامتی اسلوب میں کہی ہیں۔ گویا میں نے رباب کے تاروں سے کیف و مستی کا حامل نغمہ چھیڑا ہے۔ فلسفیانہ تصنیف کی بنیاد عقل و فکر پر ہے جبکہ اور اصلاحی شاعری کی بنیاد ذکر پر استوار ہے۔ اے مرد مومن تو اس ذکر و فکر کے سرمایہ کا وارث بن جا۔ میں ایک ندی کی مثل ہوں اور میرے پانی (افکار) کا منبع و ماخذ یہی دو سمندر یعنی ذکر و فکر ہیں۔ محبوب حقیقی سے جدائی میری جدائی بھی ہے اور یہی میرے لئے وصل کا باعث بھی (کہ موت کے بعد محبوب سے وصل ہو گا) چونکہ میرے عہد کا مزاج یکسر بدل گیا ہے اس لئے میں نے اپنے افکار کو اس کے ساتھ مطابقت کر کے پیش کیا ہے (یعنی افکار اسلامی کی تعبیر نو پیش کی ہے)

نوجوانوں کے ہونٹ پیاسے ہیں اور ان کے جام خالی ہیں (یعنی وہ دین کے اسرار و رموز سے نا آشنا ہیں)۔ ان کے چہرے دھلے ہوئے ہیں (یعنی ظاہر پرست ہیں) جبکہ روح تاریک

ہے۔ تاہم ان کے دماغ (علوم جدیدہ کے باعث) روشن ہیں۔ (لیکن اپنے مذہب سے بیگانگی کے سبب) وہ کم نگاہ، بے یقین اور مایوس و ناامید ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی آنکھیں کچھ دیکھنے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ معمولی لوگوں کی طرح اپنی خودی کے منکر ہیں اور اغیار پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اندر (عشق رسولؐ کا) جذبہ کارفرما نہیں ہے۔ (ان خداوندان مکتب نے لوگوں کی) روحوں سے نور فطرت کو دھو ڈالا ہے۔ لہٰذا اب اس (امت کی) شاخ پر ایک بھی خوبصورت پھول نہیں کھل سکتا۔ ہمارے معمار (ارباب اختیار) نے ہماری (بنیاد کی) اینٹ کو ہی ٹیڑھا رکھا ہے اور یہ شاہین بچوں میں بطخ کی فطرت پیدا کر رہے ہیں۔ اسی مضمون کا حامل اقبال کا اردو شعر ہے کہ:

شکایت ہے مجھے یا رب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

علم جب تک زندگی سے سوز حاصل نہیں کرتا تب تک دل بھی روحانی تجربات سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ اے مسلمان! تم جو علم حاصل کر رہے ہو وہ صرف مقامات کی تشریح کرتا ہے (یعنی اس کی رسائی صرف ظاہری سطح تک ہے) اس علم کے ذریعے صرف مظاہر کائنات کی تفسیر ہی ممکن ہے اور کچھ نہیں! چاہیے یہ کہ احساس کی آگ میں خود کو جلایا جائے تا کہ تو اپنی چاندی کو خام تانبا سے تمیز کرنے کا اہل ہو سکے۔ حقیقت کا علم، پہلے تو صرف حواس تک محدود رہتا ہے مگر جب انسان میں پختگی آ جاتی ہے تو وہ واصل حق ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ یہ علم اس درجہ لامحدود ہو جاتا ہے کہ انسانی شعور میں ہرگز نہیں سما سکتا۔

اے نوجوان تو نے اہل علم وفن سے سینکڑوں کتابیں پڑھی ہیں مگر وہ درس جو (مرشد کی) نظر سے حاصل کیا جاتا ہے کتابی علم سے کہیں افضل و برتر ہے۔ وہ شراب جو (اس کی) نظر سے ٹپکتی ہے (یعنی مرشد سے جو فیض جاری ہوتا ہے) اس سے ہر کوئی بقدر ظرف واستطاعت مستفیض ہوتا ہے۔ صبح کے وقت چلنے والی خوشگوار ہوا سے چراغ تو بجھ جاتا ہے لیکن گل لالہ شگفتہ ہو جاتا ہے (اشارہ ہے ظرف وصلاحیت کی طرف)۔ کم کھانے والا، تھوڑا سونے والا اور کم بولنے والا بن جا اور پرکار کی طرح اپنے گرد گھومتا رہ (یعنی اپنی خودی کی حفاظت کر)۔ مولوی کے نزدیک خدا تعالیٰ کا منکر کافر ہے لیکن میرے نزدیک اپنی ذات کا منکر بڑا کافر ہے۔ وہ شخص جو نفی ذات میں جلدی کرتا ہے وہ نہ صرف جلد باز ہے بلکہ ظالم و جاہل بھی ہے۔ (اے شخص) اپنے تئیں اخلاص کی صفت

پیدا کر اور بادشاہ و رئیس کے خوف سے بے نیاز ہو جا۔ قہر و رضا ہر حال میں عدل ملحوظ رکھ
تونگری و مفلسی دونوں صورتوں میں میانہ روی اختیار کر۔ گو یا احکام شرعیہ سخت ہیں لیکن تو ان کی بجا
آوری میں ٹال مٹول نہ کر اور اپنے قلب و ضمیر سے راہنمائی حاصل کر۔ روح کی حفاظت یہ ہے کہ
بے حساب ذکر و فکر کیا جائے اور تن کی حفاظت یہ ہے کہ ایام جوانی میں نفس پر قابو رکھا جائے۔
روح و تن کی حفاظت کئے بغیر عالم پست و بالا کی حاکمیت نصیب نہیں ہو سکتی۔ سفر کا مقصود تو وہ
لذت ہے جو دوران سیاحت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر تیری نظر آشیانہ پر ہے تو پھر (بہتر یہی
ہے) کہ تو پرواز نہ کر۔ چاند اس لئے گردش کرتا ہے کہ اپنے متعین مقام تک پہنچ جائے جبکہ انسان
کے لئے دوران سفر کسی منزل پر ٹھہرنا حرام ہے۔ زندگی لذت پرواز کے سوا کچھ نہیں اور منزل پر
قیام اس کی فطرت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کوے اور گدھ کا رزق قبر کی مٹی کے اندر ہے جبکہ
بازوں کا رزق آسمان کی وسعتوں میں ہے۔

اے مخاطب! دین اسلام کی حقیقت، سچ بولنے، حلال رزق کھانے اور خلوت و جلوت یعنی ہر
حال میں خدا کو حاضر و ناظر ماننے میں پوشیدہ ہے۔ تو دین کی راہ میں ہیرے کی طرح سخت ہو جا
اور استقلال سے جی۔ اپنے دل کو نور حق سے منور کر اور بے وسوسہ زندگی بسر کر۔ میں تجھے امور
دین میں سے ایک راز بتاتا ہوں یعنی تجھے سلطان مظفر گجراتی کا واقعہ سناتا ہوں۔ یہ بادشاہ
اخلاص عمل میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا اور بادشاہ ہونے کے باوجود فقر و سلوک میں حضرت بایزید
بسطامی کا ہمسر تھا وہ اپنے گھوڑے کو بیٹوں کی طرح عزیز رکھتا تھا۔ سلطان مظفر سخت جاں تھا اور فن
حرب میں اپنی مثال آپ تھا۔ شرفائے عرب کی طرح سبز پوش تھا (یعنی درویش منش تھا)۔ اہل
حسب و نسب کا مالک یہ بادشاہ بے عیب کردار کا مالک اور باوفا تھا۔ اے صاحب فہم و دانش امر
مومن کے لئے قرآن حکیم، تلوار اور گھوڑے سے عزیز تر کون سی چیز ہو سکتی ہے۔ میں سلطان مظفر
کے اس زبردست گھوڑے سے متعلق کیا کہوں کہ وہ پہاڑوں اور دریاؤں میں سے ہوا کی طرح
گزر جاتا تھا۔ (بالخصوص) جنگ کے روز اس کی تندی اور تیزی کے سامنے پہاڑ اور وادیاں کچھ
وقعت نہ رکھتی تھیں۔ اس کی تیز رفتاری میں قیامت کے فتنے پوشیدہ تھے اور اس کے سموں کی
ضربوں سے پتھر بھی ریزہ ریزہ ہو جایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ حیوان، کہ جو انسان کی طرح معزز
و نجیب تھا، پیٹ کے درد سے نحیف و نزار ہو گیا۔ طبیب نے اس کا علاج شراب سے کیا۔ یوں
بادشاہ کا گھوڑا صحت یاب ہو گیا لیکن حق پرست اور پابند شرع بادشاہ نے پھر کبھی اس گھوڑے کو

طلب نہیں کیا۔ اس لئے کہ اس کے تقویٰ و پرہیز گاری کا انداز ہمارے طریقہ سے بہت مختلف تھا۔ اے نوجوان! خدا تجھ کو قلب و جگر عطا کرے۔ ذرا اس مرد مسلمان کی اطاعت و تقویٰ کو ملاحظہ کر۔

دین، طلب اور جستجو کی آگ میں سرتا سر جلنے کا نام ہے۔ اس کی انتہا عشق ہے اور اس کا آغاز ادب۔ پھول کی تمام تر قدر و قیمت اس کے رنگ و بو کے باعث ہے، بے ادب شخص نہ صرف بے رنگ و بو ہے بلکہ بے آبرو بھی ہے۔ جب میں کسی نوجوان کو بے ادب دیکھتا ہوں تو (غم کے باعث) میرا روشن دن، رات کی طرح تاریک ہو جاتا ہے۔ پھر میرے سینہ میں اضطراب و اضطرار بڑھ جاتا ہے اور (بے اختیار) مجھے نبی کریم ﷺ کا (مثالی) عہد یاد آنے لگتا ہے۔ میں اپنے (پرآشوب) عہد سے بیزار ہو جاتا ہوں اور ماضی (کی یادوں میں) پناہ ڈھونڈنے لگتا ہوں۔ (اے مخاطب) عورت کا ستر یا تو اس کا شوہر ہے یا پھر قبر کی مٹی جبکہ مرد کا ستر، اپنے آپ کو برے دوست کی صحبت سے محفوظ رکھنا ہے۔ بری بات کو زبان پر لانا غلطی ہے کہ کافر و مومن سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں (یعنی انسان کو حسن ظن سے کام لینا چاہیے اور کسی کو برا نہ کہنا چاہیے)۔ انسانیت، انسان کے احترام کا نام ہے (پس اے شخص) تو انسان کے مقام و حیثیت سے باخبر ہو جا۔ انسان کی بقا کا راز باہمی میل جول میں ہی مضمر ہے۔ لہٰذا تو دوستی کے راہ پر قدم رکھ۔ عاشق صادق محبوب حق کا طالب ہوتا ہے اور وہ اسی سے راہنمائی حاصل کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کافر و مومن کو اللہ کی مخلوق سمجھتے ہوئے ان پر یکساں طور سے مشقت کرتا ہے۔ (اے مخاطب) اپنے کفر و دین (عقائد و نظریات) کو اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپا رکھ (اور مخلوق خدا سے حسن سلوک روا رکھ) اگر دل دوسرے دل سے بیزار ہے تو ایسے دل پر صد افسوس ہے۔ اگرچہ دل پانی و مٹی (عناصر) کا پابند ہے (لیکن اس کی وسعتوں کا کیا ٹھکانا) یہ تمام دنیا دل کی ہی دنیا ہے۔

اے مخاطب! اگرچہ تو دیہاتوں (جاگیر) کا مالک بن جائے، مگر کسی بھی حال میں فقر کو ہاتھ سے نہ جانے دے۔ فقر کا سوز تیری روح کے اندر سویا ہوا ہے۔ یہ قدیم شراب تیرے آباؤ اجداد کی وراثت ہے۔ دنیا میں درد دل کے سوا کوئی دوسرا سامان طلب مت کرو۔ نعمت خدا تعالیٰ سے طلب کرو، بادشاہ سے مت مانگو۔ اے (مخاطب) بہت سے حق اندیش اور صاحب نظر افراد کثرت دولت و نعمت سے اندھے ہو جاتے ہیں۔ (یعنی راہ حق سے بھٹک جاتے ہیں) دولت کی

کثرتِ دل سے سوز و گداز کو چھین لے جاتی ہے۔ یہ نیاز کو لے جاتی ہے اور اس کی جگہ فخر و ناز لے آتی ہے۔ میں کئی سالوں تک دنیا میں مصروف سیاحت رہا ہوں، اس دوران میں نے بہت کم امراء کو بہ چشم نم دیکھا ہے۔ میں اس شخص کے قربان کہ جو درویشانہ انداز میں زندگی بسر کرتا ہے، اس شخص پر تو بہت افسوس ہے کہ جو خدا سے بیگانہ ہو کر جی رہا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اب مسلمانوں میں وہ ذوق و شوق مت ڈھونڈ (کہ جو کبھی ان کے مزاج کا حصہ تھا) اب ان میں پہلے سا یقین، رنگ و بو اور ذوق و شوق نہیں رہا۔ اب علماء علم قرآن سے یکسر بے نیاز ہیں اور صوفیا بھی خونخوار بھیڑیوں کی مانند ہیں، انہوں نے محض دکھاوے کو بال بڑھا رکھے ہیں۔ اگر چہ اب بھی خانقاہوں کے اندر حق ہو کی آوازیں بلند ہوتی ہیں، لیکن ایسا مردِ مومن کہاں کہ جس کے جام میں شراب حقیقت ہو۔ اس عہد میں مسلمان مغرب زدہ ہو گئے ہیں اور (ان کی ظاہر پرستی کا یہ عالم ہے کہ) یہ سراب میں چشمہ کوثر کو تلاش کر رہے ہیں۔ یہ سب کے سب حقیقت دین سے بے خبر ہیں، یہ دراصل اہل کینہ و بغض ہیں۔ خواص میں خیر و خوبی کا تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ تاہم میں نے عوام میں صداقت و تقویٰ کی خصوصیات کو پایا ہے۔ اے مخاطب! تو اہل دین کو اہل کینہ سے علیحدہ سمجھ اور ان میں فرق روا رکھ، تو ان لوگوں کی صحبت اختیار کر جو اہل حق ہیں۔ گدھوں کے طور اطوار کچھ اور ہیں جبکہ شاہینوں کی پرواز کا عالم ہی کچھ اور ہے۔ (یہاں دنیا داروں کو گدھوں، جبکہ اہل حق کو شاہینوں سے تعبیر کیا گیا ہے۔)

مردِ مومن آسمان سے بجلی کی طرح نازل ہوتا ہے اور مشرق و مغرب کے شہر و صحرا اس کا ایندھن بنتے ہیں۔ ہم ابھی تک کائنات کی تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں جبکہ وہ (مردِ مومن) اہتمام کائنات میں شریک ہے۔ وہی کلیمؑ ہے، مسیحؑ ہے اور خلیلؑ بھی ہے، مردِ مومن ہی محمدؐ ہے، قرآن بھی ہے اور جبرائیلؑ بھی وہی ہے وہ (یعنی مردِ مومن) اہل دل کی کائنات کا سورج ہے اور اسی کی پرسوز شعاع عشاق کو زندگی کی حرارت بخشتی ہے وہ پہلے تجھے اپنے (عشق کی آگ) میں جلاتا ہے اور پھر تجھے جہان بانی کے اصول و ضوابط سکھاتا ہے، ہم سب اسی کے عشق کے سوز سے صاحب دل ہیں، وگرنہ تو ہم پانی اور [illegible] مرکب نقوش باطل ہیں۔ (اے مخاطب) میں اس عہد سے ڈرتا ہوں کہ جس میں تو پیدا ہوا ہے، اس وجہ سے کہ یہ زمانہ ظاہر پرست ہے اور باطن پر ہرگز توجہ نہیں دیتا۔ جب روحوں کے قحط کے باعث بدن سستے ہو جاتے ہیں تو مردِ مومن اپنی ذات میں مستور ہو جاتا ہے۔ پھر تلاش و جستجو اس مرد کو نہیں پا سکتی، اگر چہ لوگ اس کو اپنے روبرو پائیں۔

مگر تو ذوق طلب کو ہرگز ہرگز ہاتھ سے جانے نہ دے، اگرچہ تیری راہ میں سینکڑوں دشوار کن مراحل پیش آئیں۔ تلاش کے باوجود اگر تو کسی صاحب خبر و نظر کی صحبت نہیں پاتا تو (مایوس نہ ہو بلکہ) جو کچھ میں نے اپنے اسلاف سے حاصل کیا ہے، تو بھی اسی میراث کا امین بن جا۔ تو مولانا رومیؒ کو اپنا رفیق راہ بنا لے، یہاں تک کہ خدا تعالیٰ تجھ کو بھی سوز و گداز کی دولت سے بہرہ ور فرما دے۔ اس لئے کہ رومی نے مغز کو پوست سے جدا سمجھا (یعنی انہوں نے ظاہر کی بجائے باطن پر توجہ دی) اور کوچہ یار میں ان کے پاؤں مضبوطی سے جمے۔ لوگوں نے ان کے اشعار کی تشریح و تصریح کی ہے لیکن خود انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ ان کے کلام کے معنی ہم سے ہرنوں کی طرح دور بھاگ جاتے ہیں۔ (ان کا مفہوم ہماری عقل سے بالاتر ہے) (یہی وجہ ہے کہ) ان کے اشعار سے جسم کا رقص تو سیکھا لیکن روح کے رقص سے چشم پوشی کی۔ جسم کا رقص مٹی کو گردش میں لے آتا ہے جبکہ روح کا رقص آسمانوں کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ روح کے رقص سے علم و حکمت کا حصول ممکن ہوتا ہے، اس سے زمین و آسمان کے تمام اسرار آشکار ہو جاتے ہیں۔ اسی سے فرد جذب کلیم کا حامل بنتا ہے اور اجتماعی سطح پر قوم اس کے باعث عظیم سلطنت کی وارث بنتی ہے۔ روح کا رقص دیکھنا یقیناً ایک بڑا کام ہے اور غیر اللہ کو جلا دینا بھی ایک بڑا کارنامہ ہے۔ جب تک حرص و غم کی آگ جگر کو جلاتی رہے، اے بیٹے! تب تک روح رقص میں نہیں آ سکتی۔ غم ایمان کو کمزور بناتا ہے اور انسان کے دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے، اے نوجوان! غم نصف بڑھاپا ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ حرص، دائمی مفلسی و محتاجی ہے۔ میں اس شخص کا غلام ہوں کہ جو اپنے آپ پر قابو پانا جانتا ہے۔ اے میری بے قرار روح کی تسکین! اگر تجھے روح کا رقص نصیب ہو تو دین مصطفیٰ کا اصل راز میں تجھے بتاؤں گا اور قبر کے اندر بھی تیرے لئے دعا گو ہوں گا۔

(مرسلہ! رحمت اللہ شاہ بخاری)

الحاد کو شکست فاش

ہارون یحییٰ

فطری علوم: ڈارونزم کی شکست اور ذہین ڈیزائن کی فتح

ابتداء میں بتایا جا چکا ہے کہ انیسویں صدی عیسوی میں الحاد پرستی کو جو عروج حاصل ہوا، اس کی وجہ ڈارون کا نظریہ ارتقاء تھا۔ ڈارونزم نے جو یہ اخذ کرتا ہے کہ انسان اور دیگر تمام جاندار اشیاء کی ابتداء بے شعور فطری نظاموں کی عمل پذیری سے ہوئی ہے، الحاد پرستوں کو وہ موقع فراہم کیا جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے تھے۔ لہٰذا اس زمانے کے کٹر ترین الحاد پرستوں نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور ملحد مفکرین، مثلاً مارکس اور اینجلز نے اسی نظریئے کو اپنے فلسفے کی بنیاد بھی بنا ڈالا۔ تب سے لے کر آج تک ڈارونزم اور الحاد پرستی کا تعلق جاری وساری ہے۔

مگر اس نظریئے کو، جو ملحدانہ عقائد میں سرفہرست رہا ہے اور جسے ان حلقوں کی جانب سے زبردست حمایت حاصل رہی ہے، بیسویں صدی کی سائنسی دریافتوں نے شدید صدمات سے دوچار کر دیا ہے۔ رکازیات، حیاتی کیمیا، فعلیات اور جینیات وغیرہ جیسے میدانوں میں ہونے والی دریافتوں نے اس نظریہ ارتقاء کے مختلف پہلوؤں کی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ (اس ضمن میں جناب ہارون یحییٰ کی کتاب Evolution Deceit بطور خاص مطالعے کے قابل ہے۔ ادارہ) ہم اس بارے میں دیگر کئی کتب اور مضامین میں تفصیل سے روشنی ڈال چکے ہیں تاہم ذیل میں ان تمام نکات کا خلاصہ دیا جا رہا ہے:

رکازیات: ڈارون کا نظریہ ارتقاء اس مفروضے پر قائم ہے کہ تمام جاندار انواع صرف ایک مشترک جد امجد سے وجود میں آئے اور یہ کہ طویل عرصے کے دوران مختلف تدریجی تبدیلیوں سے گزرتے ہوئے انہوں نے ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ صورت اختیار کر لی۔ یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ اس نظریئے کے ثبوت، پتھروں میں نقش ان جانداروں کی باقیات یعنی ”رکازات“ (Fossils) کے ریکارڈ سے دریافت ہو جائیں گے۔ مگر بیسویں صدی کے دوران رکازات پر کی گئی تحقیق نے بالکل مختلف تصویر پیش کی ہے۔ اب تک کسی ایک ایسی غیر مشکوک درمیانی نوع (Intermediate Species) کے رکاز بھی نہیں مل سکے ہیں جنہیں بنیاد بنا کر تدریجی ارتقاء کے مفروضے کو صحیح تسلیم کیا جا سکے۔ اس کے برعکس جاندار انواع کی ہر جماعت رکازی

ریکارڈ میں اچانک ہی سامنے آتی ہے اور اس کے سابقہ جد امجد کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔" کیمبری دھماکے" کے نام سے پہچانا جانے والا مظہر اس کی خصوصی مثال ہے۔ اس ابتدائی ارضیاتی عہد میں جانوروں کے تقریباً تمام فائیلا (بڑے گروہ جو جسمانی طور پر ایک دوسرے سے مختلف تھے) اچانک ہی ظاہر ہو گئے۔ جانداروں کے متعدد و مختلف زمروں میں، ایک دوسرے سے نہایت جداگانہ ساخت اور پیچیدہ جسمانی اعضاء اور نظام رکھنے والے جوق در جوق جانوروں کا یہ اچانک ظہور، کہ جن میں صدفئے، آرتھروپوڈز ایکینوڈرمز اور (جیسا کہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے) ریڑھ کی ہڈی والے جانور تک شامل ہیں، ڈاروِنزم کو پہنچنے والا نہایت اہم صدمہ ہے۔ کیونکہ خود ارتقاء پرست ماہرین بھی متفق ہیں کہ کسی جاندار گروہ کا یوں اچانک وجود میں آ جانا مافوق الفطرت ڈیزائن کی، بہ الفاظ دیگر "تخلیق" کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

حیاتیاتی مشاہدات: اپنا نظریہ وضع کرتے ہوئے ڈارون نے ان مثالوں پر تکیہ کیا تھا کہ جانوروں کی نسل خیزی کروانے والوں نے کس طرح گھوڑوں اور کتوں کی نئی نسلیں تیار کی تھیں۔ محدود تبدیلیاں جن کا ڈارون نے مشاہدہ کیا تھا، ان کا اطلاق اس نے ساری فطری دنیا پر کیا اور کہا کہ کوئی بھی شے اسی طرح سے کسی مشترکہ جد امجد سے وجود پذیر ہو سکتی تھی۔ تاہم یاد رہے کہ ڈارون کے یہ تمام دعوے انیسویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں جب سائنس کے بارے میں ہماری آگہی کی وسعت و گہرائی بہت زیادہ نہیں تھی۔ بیسویں صدی میں یہ معاملات بہت زیادہ تبدیل ہو چکے ہیں۔ برسہا برس تک جانوروں کی متعدد انواع پر کئے گئے تجربات و مشاہدات سے ثابت ہو چکا ہے کہ کسی بھی جاندار میں ہونے والی تبدیلیاں ایک مخصوص جینیاتی حد سے کبھی آگے نہیں بڑھ سکی ہیں۔ ڈارون کے خیالات، مثلاً "مجھے اس بات کو قبول کرنے میں کوئی دشواری نہیں کہ ریچھوں کی کوئی نسل فطری انتخاب کے ذریعے تبدیل ہوئی ہوگی اور اس کی عادتوں میں پانی کا عمل دخل بڑھتا گیا ہوگا، اس کے منہ بڑے سے بڑے ہوتے گئے ہوں گے اور آخر کار وہ (نسل) وہیل جیسے عفریت نما جاندار کی شکل میں آ گیا ہوگا" ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کتنا بے خبر تھا۔ علاوہ ازیں تجربات اور مشاہدات کے بعد یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ تغیرات (Mutations) جنہیں "جدید ڈاروِنزم" Neo-Darwinism کے تحت ارتقائی نظام کا حصہ قرار دیا جاتا ہے، کسی بھی جاندار میں نئی جینیاتی اطلاعات کا اضافہ نہیں کرتے۔

زندگی کی ابتداء: ڈارون نے تمام جانداروں کے مشترکہ جدامجد کا تذکرہ کیا ہے مگر کبھی یہ نہیں بتایا کہ یہ ''اولین مشترکہ جدامجد'' بذات خود کیسے وجود میں آیا۔ اس بارے میں اس کا اکلوتا قیاس یہ تھا کہ اولین خلیہ، بے ترتیبی اور بدنظمی سے ہونے والے کیمیائی تعاملات کے نتیجے میں اتفاقاً وجود پذیر ہوا ہوگا جو شاید ''کسی چھوٹے اور قدرے گرم آبی جوہڑ میں بنا ہوگا''۔ مگر وہ ارتقائی حیاتی کیمیا داں، جنہوں نے ڈارون کے نظریئے میں اس جھول کو دور کرنے کی کوششیں کیں، انہیں بھی شدید مایوسی کا سامنا ہوا۔ آسان الفاظ میں یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ تمام تجربات و مشاہدات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ بے ترتیب کیمیائی تعاملات کے ذریعے، بے جان مادے سے جاندار خلئے کا وجود میں آنا ''ممکن ہی نہیں''۔

اس ضمن میں فریڈ ہوئیل جیسا کٹر مادہ پرست بھی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ یہ منظر ''ایسا ہی ہے جتنا امکان اس بات کا ہے کہ کاٹھ کباڑ سے بھرا ہوا کوئی میدان، بگولے کی زد میں آجائے اور وہاں پڑے ہوئے سازو سامان سے بوئنگ **747** جیسا کوئی طیارہ بن جائے''۔

ذہین ڈیزائن: خلیات، ان کی تشکیل کرنے والے پیچیدہ سالمات، جسم میں ان خلیات کی غیر معمولی تنظیم اور جانداروں میں زبردست منصوبہ بندی اور نازک توازن کا مطالعہ کرنے والے سائنس دانوں کو آج اسی حقیقت کے ثبوت مل رہے ہیں جسے مسترد کرنے کے لئے تمام ارتقاء پرست کمربستہ ہیں: جاندار اشیاء کی دنیا ایسے پیچیدہ ڈیزائن سے بھری پڑی ہے جس کی مثال کی جدید فنیاتی آلے میں بھی بمشکل دیکھی جاسکتی ہے۔ صورت گری کی نہایت نفیس مثالیں، جن میں وہ آنکھیں بھی شامل ہیں جو کسی کیمرے سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہیں، پرندوں کے وہ بازو بھی کہ جنہوں نے پرواز کی ٹیکنالوجی وضع کرنے پر ہمیں اکسایا، وہ انتہائی پیچیدہ اور مربوط نظام بھی جو ہر جاندار کے ایک خلئے میں ہے، اور وہ معلومات بھی جو ڈی این اے میں محفوظ ہیں، نظریہ ارتقاء کی پیدا کردہ اس خام خیالی کی مکمل طور پر نفی کرتی ہیں جس کے مطابق تمام جاندار اشیاء محض ایک اندھے اتفاق کا حاصل ہیں۔

بیسویں صدی کے اختتام تک ان تمام حقائق نے ڈارونزم کو ایک طرف محصور کردیا۔ آج امریکہ سے لے کر یورپی ممالک تک، ذہین ڈیزائن کے نظریئے کی مقبولیت میں زبردست اضافہ ہو رہا ہے اور سائنس داں بڑی تیزی سے اس تصور کو قبول کر رہے ہیں۔ ذہین ڈیزائن کا دفاع

کرنے والے ماہرین کا کہنا ہے کہ ڈاروزم، سائنسی تاریخ کی زبردست غلطی ہے اور یہ سائنس کے میدان پر مادہ پرست فلسفے کے تسلط کے نتیجے میں پروان چڑھایا گیا۔ سائنسی دریافتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ تمام جانداروں میں ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی اور صورت گری کارفرما ہے جو انکی تخلیق کا ثبوت ہے۔ مختصر یہ کہ سائنس نے ایک بار پھر ثابت کر دیا ہے کہ خدا نے تمام جانداروں کو تخلیق کیا ہے۔

نفسیات: فرائڈ پرستی کا خاتمہ اور عقیدے کی مقبولیت

انیسویں صدی میں نفسیات کے میدان سے الحاد پرستی کا نمائندہ سگمنڈ فرائڈ تھا۔ آسٹریا کے نفسیات دان فرائڈ نے ایک ایسا نفسیاتی نظریہ پیش کیا جس میں روح کے وجود کو رد کرتے ہوئے، انسان سے وابستہ تمام تر روحانی اقدار کی وضاحت جنسی اور لذت پرستانہ محرکات کی مطابقت میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ تاہم فرائڈ نے سب سے زیادہ مذہب پر حملے کیئے۔

اپنی کتاب The Future of an Illusion میں، جو 1927ء میں شائع ہوئی، اس نے کہا کہ مذہبی عقیدہ ایک طرح کی اعصابی بیماری (نیوروسس) ہے اور یہ کہ جیسے جیسے بنی نوع انسان ترقی کریں گے، ویسے ویسے مذہبی عقیدہ مکمل طور پر غائب ہو جائے گا۔ اس دور کے ناپختہ سائنسی حالات کی بناء پر یہ نظریہ کسی مناسب تحقیق اور جانچ پڑتال کے بغیر ہی پیش کر دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اس بارے میں کوئی علمی مواد بھی دستیاب نہ تھا اور نہ ہی اس کا موازنہ ممکن تھا، جو اس نظریئے کی خامیوں کو ظاہر کر سکتا۔ درحقیقت، اگر فرائڈ بھی آج زندہ ہوتا اور خود اپنے پیش کردہ مفروضات کی چھان پھٹک کر لیتا تو وہ اپنے ہی دعووں کی منطقی خامیوں پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکتا اور اپنے ہی بے بنیاد تصورات پر تنقید کرنے والوں میں پیش پیش ہوتا۔

فرائڈ کے بعد سے نفسیات نے ملحدانہ بنیادوں پر آگے بڑھنا شروع کیا۔ صرف فرائڈ ہی نہیں بلکہ بیسویں صدی میں نفسیات کے دیگر مکاتب فکر بنیاد رکھنے والے لوگ بھی کٹر الحاد پرست تھے۔ ان میں سے دو نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ایک بی ایف اسکنر تھا جس نے ''کرداریت کے مکتب فکر'' (Behaviorist School) کی بنیاد رکھی اور دوسرا البرٹ ایلس جو ''عقلی جذباتی معالجے'' (Rational Emotional Therapy) کا بانی تھا۔ نفسیات کی دنیا الحاد پرستوں کا پلیٹ فارم بن کر رہ گئی۔ 1972ء میں امریکن سائیکولوجی سوسائٹی کے ایک

سروے سے پتا چلا کہ اس کے ارکان میں صرف 1.1 فیصد ماہرین نفسیات کسی حد تک کوئی مذہبی عقیدہ رکھتے تھے۔

تاہم اس دھوکے میں مبتلا بیشتر ماہرین نفسیات کی اپنی نفسیاتی تحقیقات ہی نے اس خام خیالی کا ازالہ کیا جس کے وہ شکار تھے۔ یہ بات آشکار ہوئی کہ فرائڈ پرستی کے مفروضات میں کم و بیش کوئی سائنسی حقیقت موجود نہیں تھی اور، فرائڈ اور اس قبیلے کے دیگر نفسیاتی ماہرین کے دعوں کے برعکس، یہ بھی ثابت ہو گیا کہ مذہب کوئی دماغی و اعصابی عارضہ نہیں ہے بلکہ بنیادی ذہنی صحت کا ایک حصہ بھی ہے۔ پیٹرک گلائن نے اسی صورتحال کو یوں سمیٹا ہے۔

''لیکن بیسویں صدی کے ربع آخر کا سلوک، تحلیل نفسی کے تصور سے ویسا موافقانہ نہیں رہا۔ سب سے نمایاں یہ رہا کہ مذہب کے بارے میں فرائڈ کے تصورات مکمل طور پر افسانوی ثابت ہوئے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ گزشتہ پچیس سال کے دوران نفسیات کے میدان میں ہونے والی سائنسی تحقیق نے واضح کر دیا کہ مذہبی عقیدہ جو فرائڈ اور اس کے ماننے والوں کے نزدیک اعصابی بیماری ہے یا اعصابی بیماریوں کی بنیاد، ذہنی صحت اور خوش و خرم زندگی کا اہم ترین شریک ہے۔ یکے بعد دیگرے کئے گئے مطالعات سے مذہبی عقیدے اور عمل کا نہ صرف خودکشی، شراب نوشی اور دواؤں کے غلط استعمال، طلاق اور ذہنی دباؤ وغیرہ جیسے مسائل کے حل میں نہایت مثبت کردار عیاں ہو چکا ہے بلکہ دوسری جانب شادی شدہ زندگی میں ازدواجی تعلقات پر بھی اس کی خوشگوار اثر پذیری کسی شک و شبے سے بالاتر ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ تجرباتی حقائق اس مفروضہ ''سائنسی'' اتفاق رائے کے بالکل خلاف چل رہے ہیں جو نفسیاتی معالجاتی پیشہ وروں میں پایا جاتا ہے''۔

آخر میں گلائن کہتے ہیں ''بیسویں صدی کے اختتام پر نفسیات خود کو مذہب سے ہم آہنگ کرتی محسوس ہو رہی ہے'' اور ''انسان کی ذہنی صحت کا مکمل لامذہب نقطہ نظر صرف نظری طور پر ہی ناکام نہیں ہوا بلکہ تجربے کے میدان میں بھی ناکام رہا ہے''۔

بہ الفاظ دیگر، الحاد پرستی کو نفسیات کے میدان میں بھی رسوا ہونا پڑا ہے۔

طب: ''سکون قلبی'' کی دریافت

سائنس کی ایک شاخ جس میں ملحدانہ مفروضات کی شکست کا اثر ہوا ہے، طب کا میدان

نیشنل انسٹی ٹیوٹ فار ہیلتھ کیئر ریسرچ کے تحقیق کار ڈیوڈ بی لارسن اور ان کے ساتھیوں کے ایک تجزیے میں چرچ جانے والے امریکیوں میں امراض کے حوالے سے دلچسپ مشاہدہ کیا گیا۔ ان پر انکشاف ہوا کہ باقاعدگی سے چرچ جانے والے مردوں میں چرچ نہ جانے والے مردوں کی بہ نسبت دل اور دوران خون کے دیگر امراض کی شرح 60 فیصد کم تھی۔ اسی طرح پابندی سے چرچ جانے والی خواتین کے مقابلے میں چرچ نہ جانے والی خواتین میں خودکشی کی شرح دگنی تھی۔ سگریٹ نوشی کرنے والے وہ افراد جو اپنی زندگیوں میں مذہب کو اہم ترین شمار کرتے تھے، ان میں دل پر معمول سے زیادہ دباؤ کا امکان ایسے افراد کی بہ نسبت سات گنا کم تھا جو مذہب کو غیر اہم سمجھتے تھے۔

لامذہب نفسیات دان ان مظاہر کی توجیح کسی عمومی نفسیاتی سبب کی شکل میں بیان کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ مذہبی عقیدہ کسی شخص کا مورال بلند کرتا ہے اور اسے صحت مند رکھنے میں حصہ لیتا ہے۔ اس وضاحت میں کچھ سچائی ہو سکتی ہے لیکن اگر ہم مزید باریک بینی سے جائزہ لیں تو ہم پر کہیں زیادہ ڈرامائی شے کا انکشاف ہوگا۔ خدا پر ایمان کا انسان کے مورال پر اثر کسی بھی دوسری چیز کے اثر سے زیادہ مضبوط ہے۔ مذہبی عقیدے اور جسمانی صحت کے باہمی تعلق پر کی گئی جامع تحقیق کے بعد ہارورڈ میڈیکل اسکول کے ڈاکٹر ہربرٹ بنسن نے بھی کچھ دلچسپ نتائج حاصل کئے۔ اگرچہ وہ خود کسی مذہبی عقیدے کو نہیں مانتے مگر انہوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ خدا پر ایمان اور عبادت کا جتنا زیادہ مثبت اثر انسانی صحت پر دیکھا گیا ہے، اتنا زیادہ کسی دوسری چیز میں نظر نہیں آتا۔ بنسن اس نتیجے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انہوں نے "دریافت کیا ہے کہ جتنا سکون و اطمینان مذہبی عقیدے سے ذہن کو حاصل ہوتا ہے، وہ یقین کی کسی اور شکل سے حاصل نہیں ہو سکتا"۔

عقیدے، انسانی جسم اور روح میں ایسا کیا خصوصی تعلق ہے، اگر اس کا جواب ایک لامذہب تحقیق کار بنسن کے الفاظ میں دیا جائے تو یوں ہوگا کہ انسانی جسم اور ذہن دونوں "خدا کا تصور قبول کرنے کے لئے ہی (بطور خاص) تشکیل دیئے گئے ہیں"۔

یہ حقیقت جس کا ادراک جدید سائنس کو آج ہو رہا ہے، ایسا ایک نکتہ ہے جسے قرآن

پاک نے کچھ یوں بیان فرمایا ہے: (ترجمہ) ''اللہ کی یاد سے ہی دلوں کو سکون ملتا ہے'' (سورۃ ۱۳۔ آیت ۲۸)۔ خدا پر ایمان رکھنے والے اسکی عبادت کرنے اور اسی پر بھروسا کرنے والے لوگوں کے ذہنی و جسمانی طور پر زیادہ صحت مند ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنی فطرت سے ہم آہنگ رہتے ہوئے عمل کرتے ہیں۔ انسانی فطرت کی مخالفت کرنے والے فلسفیانہ نظام ہمیشہ تکلیف، غم، پژمردگی اور اعصابی تناؤ مسلط کرنے کا باعث بنتے ہیں۔

مذہبی شخص کو سکون و اطمینان کا تجربہ اس لئے ہوتا ہے کیونکہ اس کا ہر عمل خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر، یہ سکون و اطمینان کسی شخص کو اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنے ضمیر کی آواز توجہ سے سنتا ہے۔ کوئی بھی شخص محض اس لئے مذہبی اقدار کی پاسداری نہیں کرتا کیونکہ وہ ''زیادہ سکون و اطمینان'' چاہتا ہے یا ''زیادہ صحت مند'' رہنے کا خواہشمند ہے۔ بلکہ ایسے کسی ارادے کے ساتھ مذہب پر عمل کرنے والے کو حقیقی سکون و اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا۔ خدا بخوبی جانتا ہے کہ کس نے اپنے دل میں کیا چھپا رکھا ہے اور وہ کیا ظاہر کر رہا ہے۔ کسی بھی شخص کو ذہنی سکون تبھی مل سکتا ہے جب وہ اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے پوری ایمانداری سے کوشش کرے۔ اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے: (ترجمہ) ''پس آپ یک سو ہو کر اپنا منہ (سچے) دین کی طرف متوجہ کریں، اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو تخلیق کیا ہے، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے دین کو بدلنا نہیں، یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے''۔ (سورۃ ۳۰۔ آیت ۳۰)

ان تمام دریافتوں کی روشنی میں جن کا ہم مختصراً تذکرہ کر چکے ہیں، جدید طب نے بھی مذہب کی سچائی کا اعتراف کرنا شروع کر دیا ہے۔ پیٹرک گلائن کے الفاظ میں: ''موجودہ طب صحت یابی کی سمت میں ایسی نئی جہتوں کا ادراک کر رہی ہے جو خالص مادے سے ماوراء ہیں''۔

معاشرہ: کمیونزم، فاشزم اور ہپی ازم کا زوال

بیسویں صدی میں مادہ پرستی کا انہدام صرف فلکی طبیعیات، حیاتیات، نفسیات یا طب جیسے میدانوں ہی میں عمل پذیر نہیں ہوا بلکہ سیاست اور معاشرتی اخلاقیات میں بھی یہی کچھ ہو چکا ہے۔ کمیونزم کو انیسویں صدی کی الحاد پرستی کا اہم ترین سیاسی نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نظریاتی نظام (Ideology) کے بانیان، یعنی مارکس، انجلز، لینن، ٹروٹسکی اور ماؤ، سبھی نے الحاد پرستی کو

اس میں بنیادی اصول کے طور پر استعمال کیا ہے۔ تمام کمیونسٹ حکومتوں کا اولین مقصد یہ رہا ہے کہ معاشرے کو الحاد پرستی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے اور مذہبی عقیدے کو تباہ کیا جائے۔ اسٹالن کا روس، سرخ چین، کمبوڈیا، البانیہ اور مشرقی بلاک کے بعض ممالک میں مذہبی لوگوں پر شدید دباؤ ڈالا گیا، یہاں تک کہ ان کے قتل عام سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

مگر حیرت انگیز طور پر الحاد پرستی کا پروردہ یہ خونی نظام 1980ء کا عشرہ اختتام پذیر ہونے پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اگر ہم اس ڈرامائی زوال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دراصل جو چیز منہدم ہوئی تھی وہ الحاد پرستی تھی۔ پیٹرک گلائن لکھتے ہیں:

''یقیناً، لامذہب مورخین یہی کہیں گے کہ کمیونزم کی سب سے بڑی غلطی، معاشیات کے اصولوں سے انحراف تھا۔ مگر دوسرے قوانین بھی اہمیت رکھتے ہیں..... مزید یہ کہ جیسے جیسے مورخین کمیونزم کی شکست میں درپیش حالات کا جائزہ لیتے جاتے ہیں، یہ واضح ہوتا جاتا ہے کہ سوویت اشرافیہ (Elite) بذات خود ''ایمانی بحران'' کے الحادی شکنجے میں کسے ہوئے تھے۔ ملحدانہ نظام میں.... ایک ایسے نظام میں کہ جو دروغ گوئی پر مشتمل تھا اور جس کی بنیاد ہی ایک ''بہت بڑے جھوٹ'' پر قائم تھی.... ایک طویل عرصہ گزار دینے کے بعد، سوویت نظام کو ایک عقلی اخلاقی پستی سے گزرنا پڑا جس کا اطلاق اس اصطلاح کے ہر مفہوم پر ہوتا ہے۔ عوام بشمول حاکم طبقہ اشرافیہ، ہر طرح کی اخلاقی پاسداری اور امید کے ہر احساس سے محروم ہو چکے تھے''۔

سوویت نظام میں ''ایمانی بحران'' کی ایک دلچسپ علامت، صدر میخائل گربا چیف کی ''اصلاحی کوشش'' تھی۔ صدارت سنبھالنے کے وقت سے ہی گربا چیف کی توجہ اخلاقی مسائل اور معاشی بہتری پر مرکوز تھی۔ مثلاً جو اولین کام انہوں نے کئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ شراب نوشی کے خلاف مہم شروع کی۔ معاشرے کی اخلاقی سطح بلند کرنے کے لئے انہوں نے طویل مدت تک مارکس اور لینن کے دیئے ہوئے استعارے استعمال کئے مگر ان سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکا۔

پھر اپنی حکومت کے آخری برسوں میں انہوں نے اپنی بعض تقاریر میں ''خدا'' کا لفظ بھی استعمال کرنا شروع کر دیا، حالانکہ وہ خود الحاد پرست تھے۔ فطری سی بات ہے ایمانی بحران میں مبتلا ایسے سوویت معاشرے میں اس لفظ کا ایمان سے خالی استعمال بھی کسی کام نہ آ سکا اور حالات مزید بگاڑ کی طرف بڑھتے گئے۔ آخر کار اس کا نتیجہ وسیع و عریض سوویت سلطنت کے انہدام کی

شکل میں ظاہر ہوا۔ بیسویں صدی کی تاریخ نے صرف کمیونزم ہی نہیں بلکہ انیسویں صدی کے مذہب دشمن فلسفے کے ایک اور ثمر "فاشزم" کا زوال بھی رقم کیا ہے۔ فاشزم ایک ایسے فلسفے کی پیداوار ہے جسے الحاد پرستی اور بت پرستی کا ملغوبہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ اور جو خدا پرست مذاہب کا شدید مخالف بھی ہے۔ فریڈرک نطشے نے جسے فاشزم کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے اور جو بذات خود بت پرست وحشی معاشروں کا دلدادہ تھا، عیسائیت اور ایک خدا کا تصور رکھنے والے مذاہب پر شدید حملے کئے۔ یہاں تک کہ خود کو "ضد عیسیٰ" (Antichrist) کہلوانے لگا۔ نطشے کا پیروکار مارٹن ہائیڈیگر، نازیوں کا متشدد حامی تھا۔ ان دونوں ملحد مفکرین کے نظریات نے نازی جرمنی کی روح فرسا تباہ کاریوں کو جنم دیا۔ (ہولوکاسٹ، جو انسانی تاریخ کے شیطانی کارناموں میں سر فہرست ہے، نازیوں میں قائم "اینٹی سیمیٹزم" یعنی اس نظریئے کا نتیجہ تھا جس کے تحت نہ صرف یہودیوں سے بلکہ ایک خدا کے عقیدے سے بھی شدید نفرت کی جاتی تھی۔ خدائے واحد کا یہی عقیدہ یہودیت اور اسلام، دونوں کی بنیاد بھی ہے۔) ساڑھے پانچ کروڑ نفوس کو اپنا نوالہ بنانے والی دوسری جنگ عظیم بھی فاشزم اور کمیونزم جیسے ملحدانہ نظریات کے باعث انسانیت پر مسلط ہونے والے سانحات میں سے ایک ہے۔

اس موقع پر ہمیں ایک اور ملحدانہ نظریاتی نظام "معاشرتی ڈاروِنزم" کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے جو پہلی اور دوسری جنگ عظیم، دونوں کے پس پشت محرکات میں شامل تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر جیمز جول نے اپنی کتاب Europe Since 1870 میں بتایا ہے کہ دونوں عالمی جنگوں میں سے ہر ایک کے پیچھے، معاشرتی ڈاروِنزم پر یقین رکھنے والے یورپی رہنماؤں کا فلسفیانہ نقطہ نگاہ کارفرما تھا۔ یہ یورپی رہنما اس مفروضے کے قائل تھے کہ جنگ ایک حیاتیاتی ضرورت ہے اور یہ کہ قومیں محاذ آرائیوں اور تنازعات کی بدولت ہی ترقی کرتی ہیں۔

بیسویں صدی میں الحاد پرستی کا ایک اور معاشرتی نتیجہ مغربی جمہوریتوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ موجودہ دور میں مغرب کو "عیسائی دنیا" قرار دینے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ تاہم انیسویں صدی میں تیزی سے پروان چڑھتے ہوئے الحاد پرست معاشرے نے عیسائی تہذیب کو یرغمال بنائے رکھا۔ آج ہم جسے مغربی تہذیب کہتے ہیں وہ اصل میں انہی دو تہذیبوں کا تصادم ہے۔ اور جو ملحدانہ عنصر ہی موجودہ مغربی جارحیت، اخلاقی انحطاط، مطلق العنانیت اور دوسرے منفی مظاہر کا

اصل سبب بھی ہے۔

پیٹرک گلائن نے اپنی کتاب میں اس پہلو پر بھی توجہ دلائی ہے اور خوف خدا رکھنے والے اور الحاد پرست عناصر کا باہمی موازنہ کرنے کی غرض سے انہوں نے امریکی انقلاب اور انقلاب فرانس کی مثالیں پیش کی ہیں۔ ان کے بقول، امریکی انقلاب خدا کو ماننے والوں کا لایا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے اعلان آزادی میں یہ لکھا ہے کہ خالق مطلق کی جانب سے ہر انسان کو کچھ ایسے حقوق دیئے گئے ہیں جن کا پاس ہر صورت میں لازم ہے۔ دوسری جانب انقلاب فرانس، الحاد پرستوں کا کارنامہ تھا لہٰذا فرانس کے اعلان آزادی میں خالق مطلق اور خدا جیسے الفاظ کہیں موجود نہیں جبکہ یہ اعلان ملحدانہ اور ''جدید بت پرستانہ'' تصورات سے اٹا پڑا ہے۔

ان دونوں انقلابات کے نتائج بھی ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہے ہیں۔ امریکہ میں ایک ایسا معاشرہ پروان چڑھایا گیا جہاں پر امن اور برداشت کے حامل ماحول کو فروغ دیا گیا جس میں مذہب اور مذہبی عقائد کو مقام احترام حاصل تھا۔ اس کے برعکس فرانس میں مذہب دشمنی نے پورے ملک کو خون میں نہلا دیا اور وحشت کی وہ مثالیں قائم کیں جو اس سے پہلے تاریخ میں موجود ہی نہ تھیں۔ گلائن کہتے ہیں: ''تاریخی طور پر الحاد پرستی اور اخلاقی گراوٹ میں ایک طرف، جبکہ دوسری طرف اس کا سیاسی بربادی سے بھی گہرا تعلق ہے''۔

گلائن یہ بھی بتاتے ہیں کہ امریکی معاشرے کو الحاد پرست بنانے کی کوششوں نے اس معاشرے کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ مثلاً یہ حقیقت ہے کہ **1960**ء اور **1970**ء کے عشروں میں جنسی انقلاب کی مقبولیت نے امریکی معاشرے کو شدید نقصان پہنچایا ہے، اور اس کا اعتراف خود لامذہب مورخین بھی کرتے ہیں۔

ہپی تحریک بھی اسی معاشرتی تباہی کی ایک عملی صورت تھی۔ ہپیوں کا عقیدہ تھا کہ وہ انسانیت کے لامذہب فلسفے پر عمل پیرا ہو کر، اور لامحدود منشیات اور جنس پرستی کے ذریعے روحانی سکون حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نوجوان طبقہ جو رومانوی نغموں کے ساتھ سڑکوں پر بکھرا پڑا تھا (مثلاً جان لینون کا مشہور نغمہ **Imagine** جس میں وہ ایسی دنیا کی خواہش کرتا ہے جہاں ''کوئی ملک نہ ہو اور کوئی مذہب بھی نہ ہو'') اصل میں ایک بہت بڑے فریب کا شکار تھا۔

ہپیوں کی خواہشات کے برعکس، مذہب سے خالی دنیا کے تصور نے انہیں ایک ایسے انجام

سے ہم کنار کر دیا جو درحقیقت کسی کے لئے خوشی کا باعث نہیں تھا۔ خود ان کے رہنماؤں نے یا تو 1960ء کے عشرے میں خودکشی کی یا پھر عشرہ 1970ء کے اوائل میں منشیات کے بکثرت استعمال سے، پہلے بے ہوشی اور پھر موت کی آغوش میں جا سوئے۔ بہت سے دوسرے نوجوان ہپیوں کا انجام بھی یہی ہوا۔

اسی نسل کے وہ نوجوان جو تشدد پر مائل ہو گئے تھے، خود بھی تشدد کا نشانہ بن گئے۔ 1968ء کی نسل جو خدا اور مذہب سے منہ موڑ کر یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ کسی ''انقلاب'' یا خود غرضانہ شہوت پرستی جیسے تصورات میں خیر و نجات حاصل کر لے گی، اس نے خود کو اور اپنے معاشروں کو یکساں طور پر تباہ و برباد کیا۔

بعد از الحاد دنیا کی صبح

اب تک ہم نے جتنے حقائق بھی مختصراً بیان کئے ہیں وہ سب کے سب واضح طور پر یہی ثابت کرتے ہیں کہ الحاد پرستی ایک ناگزیر شکست سے دوچار ہے۔ بہ الفاظ دیگر انسانیت، خدا کی طرف واپس آ رہی ہے..... اور خدا کی طرف واپس آئے گی۔ اس خیال کی سچائی صرف سائنسی یا سیاسی میدان تک ہی محدود نہیں ہے جن کا تذکرہ ہم نے یہاں کیا ہے۔ اہم سرکاری عہدے داروں سے لے کر فنکاروں اور گلوکاروں تک وہ تمام لوگ جو مغرب میں رائے عامہ پر اثر و رسوخ رکھتے ہیں وہ سب کے سب آج پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ مذہبی رجحان رکھتے ہیں۔ ایسے بھی کئی لوگ ہیں جو برسوں تک ایک ملحد کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے بعد حقیقت کو پہچان کر خدا پر ایمان لا چکے ہیں۔ (پیٹرک گلائن، جن کی کتاب کے حوالے ہم نے جگہ جگہ اس مضمون میں دیئے ہیں وہ بھی ایسے ہی ایک سابق ملحد ہیں۔)

اس نتیجے تک پہنچانے والی پیش رفت بھی اسی عرصے میں شروع ہوئی، یعنی عشرہ 1970ء کے نصف آخر سے۔ بشری اصول پہلی مرتبہ 1979ء میں منظر عام پر آیا۔ انہی برسوں میں ڈاروِنزم پر بھی بہ آواز بلند تنقید شروع ہوئی۔ فرائڈ کے ملحدانہ عقائد کے خلاف سنگ میل بننے والی کتاب The Road Less Travelled بھی 1978ء میں شائع ہوئی جسے اسکاٹ پیک نے تحریر کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گلائن نے اپنی کتاب 1997ء کی اشاعت میں لکھا ہے: ''پچھلے بیس سال میں شہادتوں کا ایک ایسا واضح مجموعہ سامنے آ چکا ہے جو مدتوں سے حاوی، جدید

لامذہب دنیاوی نقطہ نظر کی بنیادیں اکھاڑ رہا ہے"۔

یقیناً یہ حقیقت کہ ملحدانہ دنیاوی نقطہ نظر ڈانواڈول ہو چکا ہے، اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ ایک اور عالمی نقطہ نظر حاوی ہو رہا ہے.... جو خدا پر ایمان ہے۔ عشرہ 1970ء کے اختتام سے لے کر (یا اسلامی تقویم کے حساب سے پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء سے) مذہبی اقدار نے دنیا بھر میں عروج کی جانب سفر شروع کر دیا ہے۔ دیگر تمام معاشرتی عوامل کی طرح یہ بھی راتوں رات نہیں ہوا اور اکثر لوگ شاید اس تبدیلی کو محسوس بھی نہ کر سکے ہوں، کیونکہ یہ پیش رفت ایک طویل عرصے میں ہوئی ہے۔ تاہم وہ لوگ جو اس آہستہ رو لیکن مسلسل پیش رفت کا قدرے غور سے تجزیہ کرتے ہیں، وہ دیکھ لیتے ہیں کہ دنیا نظریاتی نظاموں کے ضمن میں ایک اہم موڑ پر پہنچ چکی ہے۔

لامذہب مورخین اس عمل کو اپنے وضع کردہ اصولوں کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جس طرح وہ وجود باری تعالیٰ کے بارے میں شدید غلط فہمی کا شکار ہیں، بالکل اسی طرح وہ تاریخ کے تسلسل میں بھی غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ درحقیقت جیسا کہ ذیل کی آیت مبارکہ میں کہا گیا ہے تاریخ ویسے ہی چلتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ متعین کرتا ہے: (ترجمہ) "تم اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ تم اللہ کی سنت میں کوئی فرق نہ پاؤ گے"۔ (سورۃ ۳۵۔ آیت ۴۳) مطلب یہ کہ تاریخ کا اپنا ایک مقصد ہے اور وہ اسی طرح چلتی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے۔ اور اللہ کا حکم اس کے عطا کردہ نور ہدایت کی مانند ہر لحاظ سے مکمل ہے:

(ترجمہ) "وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ تعالیٰ انکاری ہے مگر اسی بات کا کہ اپنا نور پورا کرے، چاہے کافر ناخوش رہیں"۔ (سورۃ ۹۔ آیت ۳۲)

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا نور ہدایت اپنے نازل کردہ مذہب کے ذریعے بنی نوع انسان تک پہنچایا ہے۔ وہ لوگ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے وہ اپنے "منہ" کے ذریعے..... مناظرے، مناقشے، پروپیگنڈے اور فلسفوں کے ذریعے.... اس روشنی کو بجھا دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ آخر کار اپنے نور ہدایت کو مکمل کر کے ہی رہے گا اور زمین پر مذہبی اقدار کا بول بالا کرے گا۔ ہو سکتا ہے کہ "تاریخ کا موڑ" وہی ہو جس کا ذکر ہم نے اس مضمون میں کیا ہے اور جس کی مختلف شہادتیں بھی ہم نے یہاں پیش کی ہیں۔ متعدد احادیث نبوی ﷺ اور

علمائے دین کے فرمودات سے بھی ہمیں یہی پتا چلتا ہے۔ یقیناً اللہ ہی سب سے بہتر علم رکھتا ہے۔

حرف آخر

ہم ایک اہم زمانے میں جی رہے ہیں۔ الحاد پرستی جسے سینکڑوں سال سے ''استدلال اور سائنس کا طریقہ'' کہہ کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ آج محض نامعقولیت اور جاہلیت کا شاخسانہ ثابت ہو رہی ہے۔ مادہ پرستانہ فلسفہ جو سائنس کو اپنی مددگار اور حامی کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا، آج اسی سائنس کے ہاتھوں شکست کھا چکا ہے۔ خود کو الحاد پرستی کی تباہ کاریوں سے بچاتی ہوئی دنیا خدا اور مذہب کی جانب ہی متوجہ ہوگی۔ اور یہ عمل برسوں پہلے شروع ہو چکا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اس زمانے میں ایمان والوں پر اہم ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انہیں دنیا کے انداز فکر میں رونما ہونے والی بڑی تبدیلیوں سے لازماً آگاہ رہنا ہے اور اس راہ پر چلتے ہوئے آفاقی سچائی کو موثر انداز سے دوسروں کے سامنے پیش کرنا ہے۔ ان کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ آج کی دنیا میں اصل جھگڑا عقیدے اور الحاد کے درمیان ہے۔ یہ کسی مشرق یا مغرب کی لڑائی نہیں ہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں خدا کو ماننے اور نہ ماننے والے لوگ موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیانتدار عیسائی، اور دیانتدار یہودی بھی (اس کشمکش میں) مسلمانوں کے اتحادی ہیں۔ اصل اختلاف مسلمانوں اور دیگر اہل کتاب (عیسائیوں اور یہودیوں) کے درمیان نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں اور دیگر اہل کتاب کا مشترکہ اختلاف ملحدین اور مشرکین سے ہے۔ تاہم اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ہم ان لوگوں سے نفرت کریں اور انہیں لعنت ملامت کریں۔ بلکہ ہمیں تو ان لوگوں کی گمراہی کا احساس کرتے ہوئے ان سے ہمدردی کرنی چاہیے۔

وہ وقت بڑی تیزی سے قریب آ رہا ہے کہ جب غفلت اور اپنے خالق سے لاعلم رہنے والے لوگ عقیدے کی دولت سے مالا مال اور بعد از الحاد دنیا سے فیض یاب ہونگے۔

- جب ہمارا دین مکمل، ہمارا نبی ﷺ برحق اور ہمارا قرآن اللہ تعالیٰ کی سچی کتاب ہے تو پھر ملت اسلامیہ کے زوال کی وجہ کیا ہے؟
- جب اللہ تعالیٰ نے ہم سے وعدہ فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہیں غالب رہو گے اور یہ بھی کہ اگر اللہ تمہارا مددگار ہے تو تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔ تو پھر ہم اسقدر مغلوب بے بس اور رسوا کیوں ہیں؟
- مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں اور حج بھی پہلے سے زیادہ کرتے ہیں۔ بزرگوں کے مزاروں پر عرس بھی خوب شاندار طریقہ سے مناتے ہیں۔ ماہ محرم میں بھی کیا جوش وخروش ہوتا ہے۔ مالدار بھی بہت ہیں اور لاکھوں لوگ کوٹھیوں، کاروں اور کارخانوں کے مالک ہیں تو پھر یہ مردنی کیوں ہے اور یہ تنزل کیوں ہو رہا ہے؟
- ہر طاقتور ملک کی نظریں ہمارے ملکوں پر کیوں لگی ہیں اور ہر طرف خون مسلم اسقدر بےدردی اور ارزانی کے ساتھ کیوں بہایا جا رہا ہے؟
- نکبت وادبار کی موجودہ حالت سے نکلنے کے لئے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور کونسے لائحہ عمل پر چل کر ہم اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں

دنیائے اسلام کیلئے وقت کے اس اہم ترین سوال کا تفصیلی جواب معلوم کرنے کیلئے

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ **حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاری** رح

کی مندرجہ ذیل تصانیف ضرور پڑھیں

تعمیر ملت (اسٹاکس)	چراغ راہ	حقیقت وحدت الوجود
مجلد 260 صفحات قیمت 100/- روپے	مجلد 240 صفحات قیمت 100/- روپے	پلاسٹک کور قیمت 25/- روپے

ملنے کا پتہ

- ادارہ اسلامیات 190 نئی انارکلی لاہور
- مدینہ کتاب گھر اردو بازار گوجرانوالہ
- دیوا اکیڈمی پلاٹ نمبر S.T.9 بلاک نمبر 3 گلشن اقبال کراچی
  [illegible]
- مرکز تعمیر ملت سلسلہ عالیہ توحیدیہ پوسٹ بکس نمبر 500 گوجرانوالہ

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف

تعمیر ملت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہ
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ
اوران کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اوراخلاق وآداب کے اسرار
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے

چراغ راہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے
اجتماعات پرارشادفرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جولوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں
کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں
اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل
کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے
خواجہؒ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا
ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق
انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔
وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔
روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔